خادمات خلق

از

مرحومہ سیّدہ خاتون

۱۹۳۲ء

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

فہرست مضامین

صفحہ

دیباچہ

یہ ترجمہ مرحومہ سیّدہ خاتون بنت خواجہ غلام الثقلین کی قلمی یادگار ہے۔
اس کی متانت اور سلاست دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اُن کی زندگی وفا کرتی
تو شاید ایک دن وہ بھی اپنے والد کی طرح انشا پردازی میں امتیاز حاصل کرتیں
مگر حکم قضا یہی تھا کہ وہ چیز جو اُن کی ادبی جدوجہد کا سنگ بنیاد ہوتی، ان
کی لوح مزار بن جائے۔

اس کتاب میں یورپ اور امریکا کی چند پاک سیرت خواتین کے
حالات ہیں جنھوں نے اپنی زندگی دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دی
تھی۔ اپنے آپ کو نوع انسانی کی خاطر مٹا کر یہ مبارک ہستیاں حیات نوعی
میں جذب ہو گئیں اور ان کے نفوس نے وہ بسیط وسعت حاصل کر لی جو زمان و
مکان کے حدود میں نہیں سماتی، اس لئے وہ ہر زمانے میں ہر قوم کے سامنے

جیتے جاگتے نمونوں کی صورت میں موجود رہیں گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کے سوانح حیات کا مطالعہ ہندوستان والوں کے لئے خصوصاً ہماری ہندوستانی بہنوں کے لئے دلچسپی اور حوصلہ افزائی کا باعث نہ ہو۔

سید عابد حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوشیزہ "جون"

جس طرح بعض مردوں نے مختلف زمانوں میں بڑے بڑے مشکل کام انجام دیے ہیں، اپنے ملک و قوم کو فائدہ پہنچایا ہے اور اپنے عمدہ کارناموں کی وجہ سے صفحہ روزگار پر اپنا نام ہمیشہ کے لئے چھوڑا ہے اسی طرح بعض خواتین کی ذات سے بھی بہت عمدہ صفات اور کارنامے ظاہر ہوئے ہیں۔ اور ما فوق العادت کام عمل میں آئے ہیں خصوصاً صاحبان شریعت اور دین کے پھیلانے والے لوگوں مثلاً حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ وغیرہ کے لئے عورتوں کی خدمات بے حد مفید اور نافع ثابت ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے ختم المرسلین صلوٰۃ اللہ علیہ کو سب سے پہلے جس نے مدد دی وہ حضرت خدیجہؓ کی ذات بابرکات تھی۔ اسی وجہ سے عورتوں کے نوع انسانی پر بڑے بڑے احسانات ہیں لیکن سیاسی اور ملکی معاملات میں بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی

عورت نے قومی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہو۔ اور اگر ایسا ہوا بھی ہو تو اس کا نتیجہ ملک و ملت کے لئے شاید ہی مفید پڑا ہو۔ لیکن دوشیزہ جون کو اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ اس ہمت والی خاتون نے نہ صرف مردانہ کام انجام دئے بلکہ قومی غیرت اور ہمت و بسالت کے لحاظ سے تمام مردوں پر سبقت لے گئی۔ وہ ایسی خاتون تھی کہ اس کے نام کو حق ہو کہ دنیا کے نامور اشخاص کی فہرست میں شمار کیا جائے نہ صرف اس کی صنف بلکہ تمام نوع بشر کے لئے اس کی ذات باعثِ فخر و مباہات ہو۔ اگر کوئی آدمی غیرت اور شجاعت کو مجسم دیکھنا چاہے تو اس کو چاہئے کہ اس خاتون کے حال پر ایک نظر ڈالے۔ اور دیکھے کہ یہ نادر اور عجوبہ روزگار ہستی کس طرح اپنے ملک کی مصیبت کے وقت اس کی فریاد کو پہنچی اور اس کو ذلت و مظلومی کی حالت سے نجات دلا کر رہی۔

درحقیقت دوشیزہ جون کا نام ایسا ہو کہ ہر فرانسیسی کو اس کی تعظیم کرنی چاہئے اور ان عظیم خدمات کو جو اس نے اپنے وطن کی خاطر انجام دیں قابلِ تعریف سمجھنا چاہئے۔ اگر مختلف ملکوں اور قوموں کی تواریخ کو غور سے مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ جب کسی شخص نے سختی اور مشکل کے وقت اپنے وطن کی خدمت کی ہے تو اپنے مرتبے اور عزت کو مدنظر رکھا ہے۔ اور اپنی فداکاری کو عزم و احتیاط کے حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ لیکن اس بلند پایہ خاتون نے جو اپنے وطن کی خاطر شہید ہوئی کبھی دولت ثروت یا عزت کو اپنا منطمح نظر نہیں بنایا۔ بلکہ جیسا کہ خود اس

نے کہا ہے اپنے مذہب اور وطن کی طرف سے حق انسانیت ادا کر دیا۔ اس کی سوانح عمری مردوں کے لئے تازیانہ غیرت ہے اور عورتوں کے لئے مقام عبرت، مشکل ہے کہ کسی میں اس قدر جمود اور سرد مہری ہو کہ وہ اس کا حال پڑھے اور اس کی رگ حمیت و شجاعت جوش میں نہ آجائے۔

جس وقت فرانس کے سیاسی مطلع پر ہر طرف سے تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ظلم کے بادل تمام ملک پر گھرے ہوئے تھے، یہ خاتون ایک بقعۂ نور بن کر چمکی اس نے اپنے ملک کو اس مصیبت سے نجات دلائی اور اپنے عزیز وطن کو غیروں کے تسلط سے بچا لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مملکت فرانس تا قیامت اس عالی ہمت خاتون کی رہین منت رہے گی ہمیں چاہئے کہ دو شیزۂ جوآن کو غیرت مجسم اور لائق تعظیم سمجھیں اور اس کے وطن کی تاریخ میں یکتا و یگانہ شمار کریں۔

"اگر عورتیں ایسی ہوتی ہیں تو بیشک عورتوں کو مردوں پر فضیلت ہے۔"

. . . .

۱۴۲۱ء (مطابق ۸۲۵ھ) میں فرانس کے بادشاہ چارلس کا دماغ مختل ہو گیا اور ملک کے کاروبار میں خرابی پڑ گئی، اسی زمانے میں ہنری پنجم شاہ انگلستان نے دعویٰ کیا کہ ان حقوق کی بنا پر جو انگلستان کے پہلے سلاطین فرانس پر رکھتے تھے فرانس کے تخت و تاج کا اصلی مالک اور وارث میں ہوں اور فرانسیسی امراء اور نوابوں میں بھی بحث چلی کہ یہ حق کس کو پہنچتا ہے۔ اور ان دونوں بادشاہوں میں

سے کون اس عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا ہو۔ اس بدنظمی اور بحث و مباحثے نے
ہنری کو اور بھی برانگیختہ کیا۔ اس کی خواہش اور آرزو پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو گئی
اور اس نے فرانس کے خلاف جنگ کا نقارہ بجا دیا۔ اس کی پہلی آرزو یہ تھی کہ ہارفلور
کے قلعوں اور جنگی عمارتوں پر قبضہ کرے۔ جو کہ دریائے سین کے داہنے کنارے پر
واقع ہیں۔ اس کے بعد اپنے لشکر کے ہمراہ (جس کی تعداد بعض مجبوریوں اور سپاہیوں
کی ناراضگی کی وجہ سے تہائی رہ گئی تھی) شہر کیلے پر جا پہنچے۔ اس نے وہی راستہ
اختیار کیا جس سے انگلستان کے ایک پہلے بادشاہ ایڈورڈ سوم کا لشکر فتحیاب ہو کر
لوٹا تھا۔ راستے میں ایک فرانسیسی لشکر جس کی تعداد آٹھ ہزار تھی ان سے دو چار
ہوا۔ ہنری کے لشکر کی تعداد نو ہزار تھی اور وہ جگہ جہاں پہلے انگریز فتحیاب ہو چکے
تھے وہاں سے قریب تھی۔ علاوہ اس کے پچھلی فتوحات کے تذکروں نے ان
کو اور بھی جوش دلایا۔ ان میں ہر ایک نے مصمم ارادہ کر لیا کہ یا تو فتح حاصل کریں
گے۔ یا مردانگی اور دلاوری کے ساتھ یہیں کٹ مریں گے۔ یا دشمن کے خون
میں اپنے ہاتھ بھریں گے یا اس زمین میں اپنے خون کا دریا بہا دیں گے۔ میدان
جنگ کی زمین بارش کی وجہ سے گیلی ہو گئی۔ علی الصباح قتل و خون پھر شروع ہو گیا
فرانسیسی سوار کیچڑ اور پانی کی وجہ سے پیش قدمی نہ کر سکتے تھے۔ انگریزی تیر اندازوں
نے جو اس زمانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اپنے دشمنوں پر تیروں کی بوچھاڑ شروع
کر دی۔ یہاں تک کہ ان پر چاروں طرف سے میدان تنگ ہو گیا اور آخر کار

بمصداق "کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ" (اکثر چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں
پر غالب آ گئی ہیں) انگریزوں کا پرچم اقبال لہرانے لگا اور فرانسیسی جان و مال کا بہت
نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔ مقتولین میں سات ذی رتبہ شہزادے اور سو امرا
آٹھ سو بڑے افسر شامل تھے۔ اور مقتول سپاہیوں کی تعداد دس ہزار سے زائد تھی
جن میں سے انگریزوں کے مقتول صرف ایک ہزار آٹھ سو تھے۔ ہنری نے فوراً شہر
کیلے کو فتح کر لیا اور نہایت شان و شوکت اور خوشی کے ساتھ انگلستان کی جانب
واپس ہوا۔ لوگوں نے بہت اعزاز کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ ارباب سیاست
نے اس کی بہت تعریف و توصیف کی۔ اس عظیم الشان فتح سے اس کو اور ترغیب
اور شوق پیدا ہوا۔ اور اس نے ارادہ کر لیا کہ جنگ کو طول دے۔ اور پوری طرح
وہاں کے تخت و تاج کا مالک بن جائے لہٰذا اس نے سنہ ۱۴۱۷ء میں پھر فرانس
پر حملہ کیا اور علاقہ نورمنڈی کو فتح کیا اور بہت سے شہروں کا محاصرہ اور مقابلہ
کرتا ہوا شہر روئن میں پہنچا۔ یہاں اس نے چھ مہینے تک محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہ
قحط اور مصیبت سے تنگ آ کر وہاں کی فوج مغلوب ہو گئی۔ اور ہنری فرانس
کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو گیا کیونکہ فرانسیسیوں میں نا اتفاقی اور خانہ جنگی
ابھی تک جاری تھی اور امرا ایک دوسرے سے رنجش رکھتے تھے اور کوئی
ایسا شخص موجود نہ تھا جو اس کی مزاحمت کرے۔

سنہ ۱۴۲۰ء میں ہنری کا ستارہ پورے عروج پر تھا۔ اور اس میں اتنی قوت

تھی کہ جو شرط چاہے شاہ فرانس پر عائد کردے۔ عہدنامہ ترائس میں بعض شرطیں داخل کی گئیں۔ اس میں یہ امور شامل تھے کہ اول ہنری چارلس کی کاتھرین سے شادی کرے۔ دوسرے دیوانے بادشاہ کی زندگی بھر فرانس کا نائب السلطنت ہو جائے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہنری فرانس پر پورا قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ تیاری کے لئے انگلستان واپس گیا۔ لیکن ابھی کچھ دن نہ گزرے تھے کہ اسے خبر پہنچی کہ ولیعہد فرانس نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کیا اور انھیں فرانس سے بھگا دیا۔ ہنری دوبارہ فرانس آیا اور اس نے پھر ایک نمایاں فتح حاصل کی۔ وہ اس ارادے ہی میں تھا کہ اس نوعمری میں فرانس کے تخت پر متمکن ہو جائے اور تمام بحر و بر کا مالک کہلائے، کہ ناگہانی موت نے اس کو تخت سے تختے پر پہنچا دیا۔ ۳۴ سال کی عمر میں اس نے اس دار ناپائدار سے کوچ کیا۔ اس کا بیٹا جو چارلس کی بیٹی کے بطن سے تھا اور آگے چل کر ہنری ششتم کہلایا) ابھی صرف ۹ ماہ کا تھا وہ حسب معاہدہ مذکورہ بالا شاہ فرانس قرار پایا۔ اس کی تاجپوشی لندن اور پیرس دونوں مقام پر ہوئی۔ اور اس کا چچا ڈیوک اوف بیڈفورڈ فرانس کا نائب السلطنت ہوا لیکن اس وقت تک تمام ملک پورے طور سے مطیع نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں نے ڈیوک آف بیڈفورڈ کی سرکردگی میں بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ کہیں پانچ سال کے بعد جاکر امید بندھی کہ اب وہ فرانس پر پورے طور پر قابض ہو جائیں گے۔ اس وقت وہ شہر ارلیان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔

انھوں نے اس کے قرب وجوار میں بڑے زبردست قلعے بنائے۔ کوہستانی توپیں لگائیں۔ اور تمام برجوں میں بارود بھر دی۔ چھ مہینے بعد یہ حالت ہو گئی کہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ شہر ارلیان والے زیادہ مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے۔ اور دیر سویر ہار ماننے پر مجبور ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرانس کی قسمت ارلیان سے وابستہ ہے اس نازک وقت پر جب کہ فرانس پر نہایت بدبختی اور مایوسی کا عالم تھا اک دست غیبی نمودار ہوا اور اس نے اس عقدے کو وا کیا۔ یعنی دوشیزہ جون ایک گوشۂ تنہائی سے نکل کر ان بدبختوں کی فریاد کو پہنچی۔ یہ خاتون محترم ایک دہقان کی لڑکی تھی جو کہ دامری کا رہنے والا تھا۔ (دامری فرانس کی سرحد پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) یہ سنہ ۱۴۱۲ء (مطابق سنہ ۸۱۵ھ) میں پیدا ہوئی۔ بچپن کے زمانے میں کسانوں کے بچوں کی طرح میدانوں اور جنگلوں میں گشت کرتی تھی۔ مویشیوں پرندوں اور درختوں سے بہت محبت رکھتی تھی۔ اپنی سیرت کے لحاظ سے نہایت متواضع محنتی اور پاکدامن تھی۔ کچھ سینا پرونا بھی جانتی تھی لیکن لکھنے پڑھنے سے قطعی بے بہرہ تھی اس زمانے میں شمالی فرانس کی حالت ان متواتر جنگوں کی وجہ سے خراب اور تباہ تھی۔ اور اس کے باشندے بیحد پریشان تھے۔ حتٰی کہ اس کے دیہات تک میں لڑائی کی خبریں پھیلی تھیں اور لوگوں کو پریشان کر رہی تھیں۔ جب وہ تیرہ سال کی ہوئی تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا اور عقیدے کی حد تک پہنچ گیا کہ اولیائے عیسوی میں سے اس کو ایک بزرگ دکھائی دیتے ہیں اور انھوں نے

اس کو تاکید کی ہو کہ مذہب اور وطن کو آزاد کرانے کا فرض اپنے سر لے۔ اور اس کے ادا کرنے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے۔ اس مکاشفے نے اس کے رنج و غم کو جو فرانس کی تباہی سے اس کے دل پر چھایا ہوا تھا اور بھی مستحکم کر دیا۔ اور ہر وقت اس کی زبان پر یہ تھا کہ "مجکو فرانس کی اس سقیم حالت کا سخت افسوس ہے" جب وہ پندرہ برس کی تھی دوبارہ اس پر وہی بزرگ ظاہر ہوئے اور انھوں نے ہدایت کی کہ جنگ کے میدان میں جاؤ! اور فرانس کے ولیعہد کے ساتھ ہو کر بہادری دکھاؤ" اس نے کہا کہ میں ایک غریب لڑکی ہوں اور اتنی ہمت نہیں رکھتی کہ گھوڑے پر سوار ہو کر لشکروں کی سرداری کروں۔ اور اس پر اپنی بےبسی کا خیال کر کے بہت رقت طاری ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد ذرا اطمینان ہوا تو اس کو تعمیل حکم کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ لہذا پہلے اس نے اپنے یہ خیالات عزیزوں اور دوستوں کو سنائے۔ لوگوں نے اس کی ہنسی اڑائی طعن وطنز کئے اور اس کے باپ سے کہا کہ ایسی لڑکی کو دریا میں غرق کر دینا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بیگانہ مردوں کے ہمراہ جنگ میں جائے۔ آخر کار اس نے ارادہ کیا کہ گھر سے فرار ہو جائے اور ولیعہد کے پاس پہنچے۔ چنانچہ اس نے یہی کیا اور ولیعہد کے پاس جا کر اس کو اپنا مکاشفہ سنایا اور وعدہ کیا کہ وہ دشمن پر فتح پائے گا۔ اور شہر ریمس میں اس کی تاجپوشی ہوگی۔ اس وقت اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی وہ بلند قد، مضبوط اور چست تھی اور اس قدر ہمت والی تھی

کہ گھوڑے پر بغیر کچھ کھائے پیئے تمام تمام دن سوار رہتی تھی ایک سفید گھوڑے پر
سوار، سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس، ایک سفید علم اپنے ہاتھ
میں لیئے وہ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا انسانوں سے بالاتر کوئی آسمانی مخلوق ہو
جاہل عوام بھی جن میں غصہ اور جہالت بھری ہوئی تھی، اس کے اس طرح مطیع
ہوگئے کہ گویا وہ ایک فرشتہ ہے جو خصوصیت کے ساتھ آسمان سے ان کی رہبری
کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگرچہ وہ محض ایک نوعمر لڑکی تھی اور رحمدل اور خوش
مزاج تھی لیکن جو حکم وہ دیتی تھی سب اطاعت کرتے تھے۔ اور اپنی پوری قوت
اس کی مدد میں صرف کرتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ اپنی بُری عادتیں ترک کرتے
جاتے تھے۔ وہ اس کے ہمراہ عبادت گاہوں میں جاکر اپنے مذہب کے مطابق
عبادت کرتے تھے جس طرف وہ رخ کرتی فتح و نصرت نصیب ہوتی۔ یہاں تک
کہ اس نے اپریل ۱۴۲۹ء (مطابق ۸۳۲ھ) میں ارلیان کی جانب رخ کیا۔
اور حالانکہ تمام ملک میں بدنظمی اور مشکلات کا دور دورہ تھا۔ انگلستان کے
لشکر کے بیچ میں سے گزر کر اپنے لشکر کے ہمراہ خوراک و سامان لے کر شہر تک آئی۔
دشمن اس کی شجاعت اور ہمت پر اتنے حیران تھے کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ
کس طرح اس سے لڑیں۔ اسی اثناء میں ارلیان کی فوج کا سپہ سالار اس کے
استقبال کو باہر آیا۔ جون نے کہا "میں تمہارے لئے ایسی مدد لاتی ہوں جو
شائد ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو، یعنی تائید غیبی!" اس کے بعد حکم دیا کہ شہر کے باہر

جن قلعوں میں انگریزی فوجیں مقیم ہیں ان پر حملہ کیا جائے ۔ آخری قلعہ ان کا اتنا مضبوط تھا کہ فرانسیسی سپاہ اس پر حملہ کرنے سے خائف تھی ۔ لہذا فوج میں مجلس شوریٰ منعقد ہوئی ۔ بہت بحث و مباحثے کے بعد یہی طے پایا کہ اس قلعے کو نہ چھیڑا جائے اس خبر کے معلوم ہوتے ہی جون نے نعرہ کیا کہ اگر تم اپنی عقل کے موافق کام کرتے ہو تو میں بھی اپنی سمجھ کے موافق کروں گی اور فوراً اپنے جاں نثاروں کو تیاری کا حکم دیا ۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے باہر جانا چاہا تاکہ انگریزی قلعے پر حملہ کرے سپہ سالار اس بات سے ڈرتے تھے ۔ انھوں نے لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے روکا ۔ اور شہر کا دروازہ بند کر دیا لیکن اس نے دروازہ توڑ ڈالا ۔ اور باہر نکل آئی ۔ لیکن جب بعض افسروں نے سنا کہ وہ شہر سے باہر جا چکی ہے تو وہ بھی اپنا لشکر لے کر اس کے ہمراہ ہو گئے ۔ ان کو اطمینان اور یقین تھا کہ فتح اور کامیابی بالآخر انھیں کو نصیب ہو گی ۔ انگریزوں پر جب میدان جنگ تنگ ہو گیا تو انھوں نے بھی لڑائی پر کمر باندھ لی اور نہایت دلیری و ہمت سے مقابلہ کیا اور بہت سپاہی اپنی جان ہتھیلی پر لیکر ڈٹ گیا ۔ جون نے کہا منجنیق کو بلند کرو ۔ وہ چاہتی تھی کہ اس پر سوار ہو کر قلعے میں داخل ہو جائے کہ ناگہاں اس دار و گیر میں اس کے ایک سخت زخم لگا جس کو اس نے صبر سے برداشت کیا ۔ لوگ اس کو ایک انگور کے باغ میں جو قریب ہی تھا لے گئے ۔ جس وقت وہ وہاں ٹھیری ہوئی تھی اس نے سنا کہ فرانس کی فوج پسپا ہو رہی ہے وہ اسی وقت باوجود زخم کی سخت

تکلیف کے سوا نہ ہو گئی اس نے اپنے ہمراہیوں کو جنگ کی ترغیب دلائی۔ اور کہا کہ ہمیں ہرگز منہ نہ موڑنا چاہئے۔ تھوڑا توقف کرو۔ کھاؤ پیو! پھر جنگ شروع کردو۔ جیسے ہی میرا نیزہ قلعے پر پہنچا فتح نصیب ہو گی۔ سپاہی اس کی باتوں سے جوش میں آ گئے۔ اور دوبارہ حملہ کیا۔ اور بعینہ جیسا اس نے کہا تھا ویسا ہی ہوا یعنی قلعہ فتح ہو گیا۔ انگریز بھاگ گئے اور شہر آزاد ہو گیا۔ اور فتح پر فتح اور کامیابی پر کامیابی ہوتی رہی یہانتک کہ شہر ڈیمس کے دروازے پر پہنچے اور جس طرح کہ اس نے پیشین گوئی کی تھی ولیعہد فرانس کی تاجپوشی کی رسم اس مقام پر ادا کی گئی۔ جس وقت اس نے بادشاہ کے سر پر تاج رکھا ایک نعرہ بلند کیا کہ اے بادشاہ عالی وقار خدا کی مشیت پوری ہوئی۔ ان رسوم کے ادا ہونے کے بعد اس کی خواہش تھی کہ اب جنگ وجدل کو چھوڑ کر اپنے گاؤں جاتے اور گھر والوں سے ملاقات کرے کہتی تھی "کاش میں وہاں جا کر اپنے بھائیوں بہنوں کے ساتھ پھر مویشی چرایا کروں۔ وہ مجکو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے" لیکن فرانسیسی جان گئے تھے کہ اس کی شخصیت کتنی اہم ہے۔ اس لئے انھوں نے واپسی کی مخالفت کی۔ اس وقت دوشیزہ جون کا خیال تھا کہ اس کے مبعوث اور مامور ہونے سے جو منشا تھا پورا ہو گیا اور اب اس کو حکم نہیں کہ جنگ میں شرکت کرے لیکن بادشاہ کے اصرار سے مجبوراً جنگ کا میپین میں شریک ہوئی اور جب کہ جنگ میں مشغول تھی گھوڑے سے گر کر قید ہو گئی، چونکہ اس زمانے کے دستور

کے مطابق لوگ قیدیوں کو بیچتے تھے۔ جون کو بھی ڈیوک آف برگنڈی کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ یہ ڈیوک انگریزوں کا ساتھی تھا۔ اس لئے اس خاتون کو اس نے انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس کے دشمنوں کا خیال تھا کہ اس کی تمام فتح و نصرت۔ عزت و وقعت سحر و جادو کے زور سے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ فرانس کو بھی یہی اعتقاد ہو گیا تھا کیونکہ اس نے اس خاتون کی تمام فداکاریوں اور خدمتوں کو فراموش کر دیا۔ بلکہ تمام فرانس میں سے ایک شخص نے بھی حق وفاداری ادا نہ کیا۔ جو نہایت احسان ناشناسی اور ذلت کی دلیل ہے۔ کسی نے بھی اس کی رہائی میں کوشش نہیں کی۔ ایک سال قید با مشقت کے بعد اس کے مقدمے کے فیصلے کے لئے محکمہ شرعیہ کا اجلاس ہوا جس کی سرکردگی پادری پوکیس کے ذمے تھی۔ یہ الزام اس پر لگایا گیا کہ وہ شعبدہ باز اور جادوگر ہے۔ اس کی طرف سے کوئی شخص بولنے والا نہیں تھا۔ اس لئے اس معصوم ہستی کو قید سے باہر لایا گیا تاکہ وہ خود جواب دہی کرے۔ جو جوابات اس نے دیئے وہ سادگی اور سچائی پر مبنی تھے اور ان فقہا کے مکر آمیز سوالات سے بالکل مختلف تھے جو اس محکمہ کے ممبر تھے جس وقت سوال کیا گیا کہ "کیا تمہارا عقیدہ ہے کہ تم مظہر الطاف خدا ہو؟" جواب دیا کہ "اگر مظہر لطف خدا نہیں ہوں تو میں دعا کرتی ہوں کہ وہ مجکو ایسا کر دے۔ اور اگر میں ایسی ہوں تو اس سے استدعا کرتی ہوں کہ وہ مجکو ایسا ہی رکھے" جب پوچھا کہ "وہ ولی جو تم پر ظاہر ہوا انگریزوں سے متنفر تھا یا نہیں" جواب دیا کہ "اولیا

ان کو دوست رکھتے ہیں جن کو خدا دوست رکھتا ہے اور ان سے نفرت رکھتے ہیں جن لوگوں سے خدا نفرت رکھتا ہے۔" رئیس اجلاس نے کہا کہ تم جھوٹی باتیں کہتی ہو اور اس غریب کو دام میں پھنسانے کے لئے دریافت کیا "خدا انگریزوں سے ناراض ہے یا نہیں؟" جواب دیا "مجکو معلوم نہیں کہ خدا انگریزوں سے نفرت رکھتا ہے یا نہیں مگر اتنا جانتی ہوں کہ جو انگریز جنگ میں نہیں مارے گئے، ان کو بادشاہِ فرانس اس ملک سے نکال دے گا، میں نے نیزے کے بجائے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور کوشاں رہی کہ کسی کو نہ ماروں اور حتی الامکان اپنا ہاتھ کسی کے خون میں آلودہ نہ کروں اول میں نے یہ کہا کہ تم سب انگریزوں پر ٹوٹ پڑو۔ اور خود بھی حملہ کیا۔ ہاتف غیبی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں علم اپنے ہاتھ میں بلند کروں اور کسی سے خوف نہ کروں خدا میری مدد کرے گا۔" سوال کیا گیا کہ "آیا فتح و نصرت تمہاری ذات سے وابستہ تھی یا اس علم سے" کہا کہ "میرا بھروسہ صرف ذات ایزدی پر تھا اور کسی چیز پر نہیں۔" کہتے ہیں کہ ایک انگریز اس مقدمے میں موجود تھا جو اس کی صداقت اور نیک نیتی پر بہت متحیر ہوا اور بولا کہ یہ نہایت شریف خاتون ہے۔ اس میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ یہ انگریز نہیں ہے۔ مقدمے کا فیصلہ کرنے والوں نے اس پر بارہ قسم کے الزام لگائے یا جادوگرنی ہونے کا ملزم قرار دیا۔ ۲۴ مئی ۱۴۳۱ء (مطابق ۸۳۵ھ) کو گرفتاری کے ٹھیک دو سال بعد اس کو قبرستان لے گئے اور وہاں دو ستون نصب کئے تھے اور پادری ایک ستون پر چڑھ گئے اور اس کو دوسرے

پڑے گئے۔ اس جگہ ایک واعظ نے نہایت غیض وغضب میں اس کو مخاطب کرکے طعن وطنز اور مکروہ الفاظ سنانے شروع کئے اور وہ بردبار خاتون نہایت صبر اور تحمل وخاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے بادشاہِ فرانس کو گالیاں دینی شروع کیں۔ اس وقت دوشیزۂ جوآن کو تاب نہ رہی اور بے صبری سے کہا کہ "میری بابت جو چاہو کہو لیکن بادشاہ کو کچھ نہ کہنا۔ وہ ایک دیندار عیسائی ہے۔ صرف تم کہتے ہو کہ وہ ایسا نہیں ہے، میں قسم کھا سکتی ہوں کہ وہ شریف ترین عیسائی ہے اور اپنے دین ومذہب کو دوست رکھتا ہے"۔ جب اس کی بات ختم ہوگئی تو واعظ نے اس کی طرف سے توبہ کی اور اس کے لئے دعا کرنی چاہی، خاتون نے اس کو ٹوکا اور کہا "میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جو توبہ کروں۔ جو کام مجھ سے ہوئے وہ سب مشیت الٰہی کے موافق تھے"۔ تب اس سے کہا گیا کہ تم کو چاہئے کہ کلیسا کے حکم کی اطاعت کرو۔ اور ڈرانے کے لئے کہا جلاد آگیا ہے اور حکم ہوچکا ہے کہ اگر تم نقیہا اور قاضیوں کی بات نہ مانو تو تم کو فوراً زندہ آگ میں جلادیں"۔ غریب لڑکی! اس نے دیکھا کہ علما اس کی عاقلانہ باتوں کو نہیں سنتے۔ تعصب اور ملک گیری کی محبت نے ان کی آنکھوں پر اس طرح پٹی باندھ دی ہے کہ سوائے اپنے کسی کی بات نہیں سنتے، سوائے اپنے مقصد کے کچھ نہیں دیکھتے۔ ایسی حالت میں جب صریحاً بڑے بڑے دلاور مردوں کے دل بھی کانپنے لگتے ہیں۔ سوائے اطاعت ظاہر کرنے کے چارہ نہ تھا۔ اس

نے کانپتے ہاتھوں سے اس توبہ کے کاغذ کو یہ کہہ کر قبول کر لیا کہ جلنے کے مقابلے میں یہ
بہتر ہے۔ اس کے بعد پادری بوویس نے فتویٰ دینا شروع کیا۔ اور کہا "چونکہ دوشیزہ
جوآن اب دائرہ ضلالت سے منحرف اور ہدایت کے طریقے پر مائل ہو گئی ہے اور دوبارہ
مقدس کلیسا کی حمایت میں آگئی ہے اس لئے کفر کی ذلت اس سے دور ہو گئی ہے
لیکن چونکہ اس نے خدا اور مقدس کیتھولک کی مخالفت میں گناہ کیا ہے اس لئے
اگرچہ عنایت اور مہربانی سے اس کی جاں بخشی کر دی گئی ہے لیکن چاہئے کہ اس
کو حبس دوام کی سزا دی جائے۔ غم و غصہ کھانے کو ملے اور ذلت و رنج کا پیالہ پینے کو"
لیکن یہ ایک عارضی مہلت تھی۔ دشمن راضی نہ ہوئے کہ اس غریب کی جاں بخشی کی جائے
اور چاہتے تھے کہ نیا بہانہ بنا کر اس کا خون کریں۔ چونکہ پہلے اپنا مقصد پورا ہونے کا
یقین نہ تھا۔ اس لئے بعد میں جادوگری کا الزام لگا کر قتل کا فتویٰ دے دیا۔ ایک
بڑا اونچا مچان شہر روآن کے بازار میں باندھا اور دوشیزہ جوآن کو وہاں لائے۔
اس جگہ اس کے تمام دشمن اور پادری لوگ جمع تھے۔ جو اس کی خرابی میں اپنی
بہتری سمجھتے تھے اور اس کے قتل پر تیار تھے۔۔ اس مجسمہ غیرت و ہمت نے کسی
قسم کے خوف یا دہشت کو اپنی طبیعت میں راہ نہ دی اور نہایت متانت اور اطمینان قلب
سے ان کا مقابلہ کیا۔ ناظرین کو چاہئے کہ اس وحشتناک منظر کا نقشہ اپنی آنکھوں کے
سامنے کھینچیں اور دیکھیں کہ ایک بدنصیب اسیر عورت کس حد تک یارائے ہمت
و شجاعت رکھتی ہے اور کیسی مصیبت میں اپنے حواس قائم رکھ سکتی ہے۔ تاریخ

عالم میں بہت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے جنگ آزمودہ شجاع جنھوں نے
میدانِ جنگ میں استقلال اور ہمت سے اپنے دشمن کا مقابلہ کیا ہے جب کبھی میدان
جنگ میں دشمن کے ہاتھوں قید ہوئے ہیں اور قصاص کی زد میں آتے ہیں۔ تو ان
کے حواس بالکل مختل ہو جاتے ہیں۔ اگر تضرع و زاری نہ بھی کریں تو بھی خوف و
ہراس ان کے چہرے سے ضرور ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لیکن یہ عجوبۂ روزگار خاتون
بالکل بے خوف اور نڈر مجمع عام میں آتی ہے۔ اگرچہ اسے یقین ہے کہ اب اس
کو آگ میں جلایا جائے گا۔ لیکن اپنی شان اور عظمت ہاتھ سے نہیں دیتی۔ بیشک
ایسی قابل قدر ہستیاں تاریخ کے صفحے مزین کرتی ہیں اور آنے والی نسلوں کے
لئے غیرت اور شجاعت کی مثال قائم کرتی ہیں۔ ہاں! اس باہمت دوشیزہ کے
لئے یہی شایانِ شان تھا کہ وہ اپنے وطن کو دشمنوں کے قبضے سے نجات دلائے
اور اس بلند مقصد کے واسطے اپنی جان گرامی کو فدا کرے۔ اگر ہم کہیں کہ یہ
ذی مرتبہ خاتون اس زمانے کے تمام مردوں پر فضیلت رکھتی ہے تو یہ کوئی مہمل
بات یا مبالغہ نہ ہو گا۔ جس وقت ان بزرگوں اور عمائدین میں ایک بھی ایسا نہیں
تھا کہ اس طرح وطن کی راہ میں قربانی کرے۔ اور اپنا نام صفحۂ تاریخ پر چھوڑ جائے
گویا مشیت ایزدی جانتی تھی کہ اس یکتائے زمانہ خاتون کو کس وقت پیدا کرے
اور کس طرح فرانس اور فرانسیسیوں کی عقدہ کشائی کرے۔ دوشیزۂ جون ایک
روشن، ایک مقدس روح تھی۔ شرافتِ مجسم! حب وطن کا پیکر! اور پرہیزگاری

کا بہترین نمونہ! اس نے آخر کار خواہش کی کہ ایک صلیب اس کے لئے لائی جائے تاکہ اس کا وقت اخیر مذہب عیسوی کی رسوم کے مطابق ہو۔ ایک انگریز سپاہی نے اپنا عصا توڑ کر ایک صلیب بنا کر اس کو دے دی۔ دوشیزہ جون کی صدا اسنے بلند ہو کر اس سکوت کو توڑا جو اس میدان پر چھایا ہوا تھا "بیشک! میں خدا کی جانب سے مامور ہوئی تھی۔ اور ہاتف غیبی نے مجکو اس بات کی ترغیب دی تھی۔ میں نے دھوکا نہیں کھایا ہے" اس کے بعد اس غریب کو تختے پر چڑھا کر آگ میں جلا دیا گیا۔ اس وقت گویا وہ اپنے وطن والوں اور ملکِ فرانس کو مخاطب کر کے کہتی تھی:-

آنکہ دائم ہوس سوختن ما میکرد کاش می آمد و از دور تماشا می کرد

اگرچہ اس کی زندگی اس طریقے سے ختم ہو گئی۔ مگر آئندہ نسلوں نے اس کی فداکاری کی قدر جان کر اس مقام پر اس کا ایک مجسمہ نصب کر دیا ہے جہاں وہ جلائی گئی تھی۔ آئندہ نسلوں کو سبق دینے کے لئے فرانس کے مختلف حصوں میں بہت سی یادگاریں قائم کی گئی ہیں۔ شاید ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ جو کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ کسی مبالغے یا مغالطے پر مبنی ہے۔ مگر ہم یہ اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے انگریزی فاضلوں کی مستند کتابوں کا ترجمہ ہے اور جس قدر ہم نے لکھا ہے اس سے زیادہ انھوں نے اس کے اعمال و افعال کی تعریف و توصیف کی ہے۔ مشہور انگریزی فلسفی سموئیل اسمائیلز اپنی کتاب "فرائض" میں اس کی

پیدائش اور تربیت اور اس کے تمام کارناموں کا حال بالتفصیل لکھنے کے بعد کہنا ہے یہ ملت فرانس نے دوشیزۂ جون آرک کو فراموش نہیں کیا ہے۔ بلکہ متعدد مجسمے محض اس کی یادگار قائم کرنے کے لئے نصب کروئے ہیں خصوصاً فرانسیسی سپاہی برسوں سے اس کے نام کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں یہاں تک کہ اب بھی جب کبھی وہ قصبہ دامری سے (جو موصوفہ کا وطن ہے) گزرتے ہیں تو اس کی جائے پیدائش کے احترام کے اظہار کے لئے فوجی سلام کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ قاعدہ تاحال جاری ہے یا نہیں؟ اس کے قتل کے پانچ سال بعد محکمۂ شرعیہ کا ایک اجلاس اٹلی کے دار الخلافہ روم میں منعقد ہوا جس کا صدر خود کیتھولک عیسائیوں کا پاپائے اعظم تھا۔ جون کی بابت دوبارہ بہت کچھ تحقیقات کی گئی اور بالآخر یہ فتویٰ دیا گیا کہ موصوفہ بے گناہ ہے اور بڑے بڑے عالموں اور فاضل لوگوں مثلاً فرانس کے والٹیر انگلستان کے سوتھی اور جرمنی کے شلر نے اس کی تعریف میں کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے شلر کی کتاب اس کی بہترین یادگار ہے۔

زندۂ جاوید ماند ہر کہ نکونام زیست — کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

سارہ مارٹین

سارہ مارٹین کے والدین بہت غریب تھے۔ ابھی وہ کم سن تھی کہ وہ دونوں قضا کر گئے اور یہ یتیم ہو گئی اس کی دادی نے اسے قصبہ کیسٹر میں پرورش کیا جو بندرگاہ یارموت کے نزدیک ہے۔ اس لڑکی کا گذارہ اس پر تھا کہ سلائی کرنے کے لئے گھروں میں جاتی تھی اور بارہ آنے روز اجرت لاتی تھی ۱۸۱۹ء (مطابق ۱۲۳۵ھ) میں ایک عورت اپنی بداطواری اور بچے کے ساتھ بدسلوکی اور بے رحمی کرنے کے جرم میں عدالت میں لائی گئی۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس کو یارموت کے جیلخانے میں رکھا جائے۔ اس عورت کے واقعے کا چرچا تمام مجلسوں اور محفلوں میں ہونے لگا۔ سارہ اس واقعے سے نہایت درجہ متاثر ہوئی۔ اس کی یہ خواہش ہوئی کہ جیل خانے میں جاکر اس عورت سے ملے اور اس کو نیکی کی ہدایت کرے اس وجہ سے وہ ہر وقت جیل کی دیوار کے قریب پھرتی تھی کہ وہاں داخل ہونے کی اجازت مل جائے تاکہ وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کر کے انہیں دین کی مقدس کتابیں سنائے ان کے اخلاق و عادات سدھارنے کی کوشش کرے اور ان کو قانون کی خلاف ورزی کرنے سے متنبہ کرے۔ آخر کار اس کے شوق نے اس کو خاموش نہ رہنے دیا اور اس نے مجلس کے دروازے

کو کھٹکھٹایا اور نگہبانوں سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی لیکن انھوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے دوبارہ نہایت اصرار کیا۔ اور اس مرتبہ اجازت مل گئی یہاں تک کہ سارہ مارٹین نے اس عورت سے ملاقات کی اور اس سے اپنا مقصد اور اپنے آنے کی وجوہ بیان کیں وہ عورت اس کی نصیحت کو سن کر اس درجہ متاثر ہوئی کہ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے اس فرشتہ سیرت خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ اس شکریے اور رقت نے سارہ کے آئندہ شغل زندگی کو ہمیشہ کے لئے مقرر اور معین کر دیا۔ یہ عورت جو کپڑے سی کر گزر اوقات کرتی تھی۔ اپنا تمام فرصت کا وقت قیدیوں کی اصلاح میں صرف کرنے لگی۔ اس زمانے میں آج کی طرح قیدیوں کے واسطے کوئی معلم یا واعظ نہیں ہوتے تھے۔ سارہ ان کو مذہبی کتابیں پڑھ کر سناتی اور لکھنا پڑھنا سکھاتی۔ اور علاوہ روزانہ فرصت کے وقت کے ہفتہ میں ایک پورا دن ان پر صرف کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ "مجکو یہ احساس ہوتا ہے کہ فضلِ الٰہی میرے شامل حال ہے"۔ یہ قیدی عورتوں کو سینے، کترنے اور بننے کی تعلیم دیتی تھی۔ اور جو چیزیں تیار ہو جاتیں ان کو فروخت کر کے اور چیزیں خرید کرتی تھی۔ اس طرح اس نے قیدیوں میں صنعت و حرفت کو رواج دیا اور مردوں کو رات کے اوڑھنے کی لوٹیاں بنانی سکھائیں۔ وہ حتی المقدور ان کو بیکاری سے باز رکھنا چاہتی تھی، تاکہ وہ بیہودہ خیالات میں گرفتار ہو کر غمگین اور فکرمند

نہ رہیں۔ غرض اس طرح قیدی مختلف کام سیکھتے تھے۔ اس نے خاص امانتی صندوق بنوائے
جن میں جیل خانے کی تمام تیار شدہ چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ جو شخص قید سے چھوٹتا تھا
اس کو اس کا حصہ دے دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنا کام چلائے۔ اور کسی شغل میں مصروف
ہو کر دنیا میں نیکنامی کی زندگی بسر کرے۔ لیکن چونکہ سارہ مارٹن ہر وقت اسی کام
میں مصروف رہتی تھی اس لئے اس کا اپنا روزگار اب بالکل نہ چلتا تھا۔ اب اُسے یہ
الجھن پیدا ہوئی کہ آیا وہ محض اپنا کام کرے۔ اور قیدیوں کا کام ترک کر دے یا نہیں
لیکن اس کام کا پہلے ہی اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔ اور وہ کہا کرتی تھی کہ میں
نے سنجیدگی سے تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لوگوں کو حقائق الٰہی
سکھانے میں خود جسمانی تکالیف اور افلاس میں مبتلا ہو جاؤں۔ اور وہ مصیبتیں جو
وقتاً فوقتاً انسانوں کو اٹھانی پڑتی ہیں۔ اتنی اہم نہیں جس قدر یہ مقدس کام یعنی
خدا کی فرماں برداری اور اس کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے کی کوشش اس لئے
وہ روزانہ اپنے سات آٹھ گھنٹے قیدیوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتی۔ لیکن چونکہ
اس کی عدم موجودگی میں فساد یا حقہ نوشی کا خطرہ رہتا تھا۔ اس لئے اس نے ایک
دار الصناعت قائم کیا۔ بعض اوقات نئے قیدی سرکش ہوتے تھے لیکن آخر کار اس کی
نرمی اور ملائمت کی وجہ سے سب اس کا احترام اور عزت کرنے لگتے۔ وہ لوگ
جنھوں نے بدکاری اور بداخلاقی کے کاموں میں داڑھیاں سفید کر لی تھیں۔ لندن
کے مشہور گرہ کٹ آوارہ بچے۔ بداخلاق مرد۔ بدکردار عورتیں۔ چور ڈاکو جن سے

جیل خانہ بھرا ہوا تھا سب اس کی مہربانی اور عنایتوں کے قائل ہوگئے۔ غور کرنیکی بات ہے کہ اس کی زیر نگرانی اور ہدایت کے بموجب ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ آیا کہ انھوں نے قلم اٹھایا اور ابتدائی کتابوں میں سے حرفوں کی شکلیں بنانی سیکھیں۔ اس خاتون کی جانب سے سب کو انتہائی حسن ظن ہوگیا اور وہ بھی ان سب سے اس قدر مانوس ہوگئی کہ کبھی ایک کا حال دریافت کرتی کبھی دوسرے سے ہمدردی کرتی کبھی تیسرے کے لئے دعا کرتی۔ اس کی عمدہ عاداتنے ان لوگوں کے دل پر بہت اثر کیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ان سب کو ذلت اور گمراہی کے گڑھے سے نکالے اور سیدھے راستے پر چلائے۔ اس پاک نفس خاتون نے بیس سال تک اس کار خیر کو جاری رکھا لیکن اس سے اس کی ذات کو کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا اس کی سالانہ آمدنی تقریباً وہی ۱۱ یا ۱۲ پونڈ (یعنی کوئی پونے دوسو روپے) تھی جو اس کی دادی کے ترکہ میں اس کو ملے تھے۔ آخری دو سال جب کہ وہ اس کام میں مصروف تھی یہ قانون جاری ہوا کہ ہر جیل خانے میں ایک واعظ اور معلم رکھا جائے۔ جب منتظمان کمیٹی نے دیکھا کہ اس خاتون کو مالی دقتیں درپیش ہیں تو انھوں نے چاہا کہ وہ بارہ پونڈ سالانہ لے لیا کرے لیکن اس تجویز کو انھوں نے ایسے بھدے طریقے سے پیش کیا کہ اس کے لطیف احساس کو ٹھیس لگی اور اس نے وظیفہ خوار بننے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنی ان خدمات کو جو میری خوشی کا سرمایہ ہیں محض درہموں کے عوض فروخت کرنا نہیں چاہتی۔ کمیٹی کے افسر اعلیٰ

نے اس کو درشتی سے کہلا بھیجا کہ اگر جیل میں آنے کی خواہش رکھتی ہو تو جو قیود وعائد کی گئی ہیں ان کی اطاعت کرو ورنہ خارج کر دی جاؤ گی۔ لہذا مجبوراً ۱۲ پونڈ سالانہ لیتی رہی۔ چونکہ وہ مجلس کے معلم اور واعظ کی خدمات انجام دیتی تھی اس لئے پارموت کی کمیٹی کے ممبر اس کو یہ رقم بطور شکرانے کے دیتے تھے لیکن اب وہ بہت ضعیف ہوگئی تھی اور جیل خانے کی آب و ہوا نے اس کی صحت کو نقصان پہنچایا تھا۔ جس وقت وہ مرض الموت میں گرفتار تھی اس نے اپنی شاعرانہ قوت سے (جو کبھی کبھی پہلے بھی اس کے دماغ میں پیدا ہوتی تھی) کام لیا یعنی بعض اشعار اور نظمیں لکھیں۔ اگرچہ وہ اشعار قافیے اور عروض کے اعتبار سے چنداں لائق تعریف نہ تھے لیکن کبھی کبھی وہ ایسے اشعار بھی موزوں کرتی تھی جو شریفانہ جذبات اور عشق حقیقی کے درد کی بدولت ایسے پر اثر اور عمدہ ہوتے تھے کہ شاید پہلے کبھی نہ لکھے گئے ہوں۔

گریس ڈارلنگ

گریس ڈارلنگ ان چند خواتین میں سے ہے جنھوں نے نہ صرف خدمتِ خلق کی بلکہ اپنی مثال اور نمونہ سے مردوں کو بھی شرافت کا سبق دیا ہے۔ اگرچہ وہ خود حسب نسب میں کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ ایک متوسط طبقہ سے تھی، لیکن نوعِ انساں کی وہ خدمات جو اس نے انجام دیں دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ اس کی اکثر ہمعصر خواتین کی خواہش تھی کہ کاش وہ اس کی جگہ ہوتیں اور یہ سعادت حاصل کرتیں! اس کی بزرگی اور شرافت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جب مستند انگریزی مصنفین نے چاہا کہ شجاعت اور جرأت قلب کو مجسم کر دکھائیں تو انھوں نے تمام دنیا کی محترم شخصیتوں میں سے اس کا نام انتخاب کیا۔ کیونکہ اس نے نیکی کے راستے اور اپنے ہمجنسوں کی حمایت میں خود اپنی جان معرضِ خطر میں ڈالی اور جہاں تک ممکن ہوا اپنی استطاعت کے موافق جد و جہد کی۔ تصور کیجئے کہ ایک لڑکی جس کا باپ منارہ کا محافظ ہو، جس کا خاندان غریب اور کم حیثیت ہو کس طرح ایسے کارہائے نمایاں کر سکتی ہے کہ اپنے زمانے کے تمام بڑے بڑے آدمیوں پر جنھوں نے نہایت عمدہ خدمات انجام دی ہیں، سبقت لے جائے۔ اور

اپنے نام کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار پر یادگار چھوڑ جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے زمانے میں اس سے پہلے اور اس کے بعد بعض ذی مرتبہ خواتین ہوئی ہیں جو دولت و ثروت اور حسب و نسب کے اعتبار سے یکتائے زمانہ تھیں، لیکن جب انھوں نے اس دار فانی سے رحلت کی اور سفر آخرت اختیار کیا تو ان کا نام ان کے ساتھ ہی معدوم ہو گیا، اور کہا جاتا ہے کہ آجتک دنیا میں ایسا نہیں ہوا کہ اس کے سوا کوئی غریب عورت جو خانہ داری کی تکلیفوں اور عسرت میں گرفتار رہی ہو، اس طرح محض اپنی نیکیوں کی برکت سے زندۂ جاوید ہو گئی ہو کہ اب تک انگلستان کے طلبہ اپنی کتابوں میں اس کی شجاعت اور فداکاری کی داستان پڑھتے ہیں اور اس کے رویے کو شریف ترین نمونہ جانتے ہیں۔

نورتھمبر لینڈ کے ساحل کی ایک سمت پتھر کی سیاہ چٹانیں ہیں جو جہازوں کے لئے از حد خطرناک ہیں ان کی وجہ سے طوفان اور ابر و باراں کے وقت کشتی چلانی سخت دشوار ہو جاتی ہے اور وہ آبادی سے اس قدر دور ہیں کہ سوائے پرندوں اور جانوروں کے کوئی وہاں نہیں رہتا۔ فی الحقیقت وہ موت کے غار اور ہلاکت کے گڑھے کا نمونہ ہیں۔ سیکڑوں کشتیاں پانی میں سفر کرتی ہوئی ان چٹانوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی ہیں، اور ہزاروں لوگ اس خطرناک بھنور میں پڑ کر راہی عدم ہوئے ہیں۔ اس کے سرے پر ایک

روشنی کا مینار ہے جس سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ ہے اور اس میں مینار کا چوکیدار مع اپنے اہل و عیال کے رہتا ہے۔ اب بھی لانگ سٹون میں چند سال قبل کی طرح جب گریس ڈارلنگ وہاں رہتی تھیں وہی منظر موجود ہے۔ اس خاتون نے تقریباً اپنی تمام عمر وہاں بسر کی ہے اور بہت کم اپنے عزیزوں کے ساتھ کسی اور ساحل پر رہی ہے۔ یہ سیاہ اور خوفناک چٹانیں باوجود اس ویرانی اور بربادی کے، باوجود لوگوں سے خالی ہونے کے اس کی نظر میں وطن کا سا آرام اور خوبیاں رکھتی تھیں۔ بعض اوقات یہ کنبہ کئی کئی ہفتہ خشکی پر نہ جاتا تھا۔ اس سے ان میں اور بھی زیادہ گہرے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اس کا والد جو اپنی جوانی کے زمانے میں مینار کا محافظ تھا لوگوں کی صحبت سے بالعموم محروم رہتا تھا لیکن اس نے فطری ذہانت اور عقلمندی کی مدد سے خود کو مہذب اور عقلمند بنا لیا تھا اور اگرچہ اس کے پاس زیادہ کتابیں مطالعہ کے لئے نہیں تھیں لیکن جو تھوڑی بہت کتابیں اس کے پاس تھیں ان کا اس نے نہایت شوق اور محنت سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے مسائل کو خوب سمجھ لیا تھا چونکہ نظر صائب رکھتا تھا اس لئے آسمانی علامتوں سے واقف ہو گیا تھا اور جنگلی جانوروں کے عادات و اطوار بخوبی سمجھنے لگا تھا اس نے اپنے سب بچوں کو بہت عمدہ تربیت دی تھی۔ گریس ڈارلنگ بھی اسی حسن تربیت سے بہرہ اندوز ہوئی اور لکھنا پڑھنا بخوبی سیکھ گئی۔ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنے مکان میں جس کے چاروں طرف دریا احاطہ

کئے ہوئے تھا خشکی سے الگ اپنی زندگی آرام اور آسودگی سے گزارتے تھے۔ وہ
انگلستان کے شور وغوغا سے بالکل محفوظ تھے۔ کوئی ہمسایہ نہیں تھا جو نظر پڑے یا اس
کی صحبت اور باتوں سے دل بہلے۔ ہمیں یہ تصور کرنا چاہیئے کہ وہ تمام کنبہ بعد ظہر
ایک چھوٹے کمرے میں بیٹھا ہے۔ گریس ڈارلنگ اور اس کی والدہ سینے میں
مشغول ہیں، اس کا باپ اپنے چراغوں کے ٹھیک کرنے میں مصروف ہے۔
یا جہازوں کو دوربین سے دیکھ رہا ہے۔ یا یہ کہ طوفان کی رات کو چاروں طرف
بخارات اٹھ رہے ہیں۔ بارش اور ہوا کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں اور
بعض پچھلے طوفانوں سے جو جہاز ٹوٹ گئے تھے اور جن کے آلات اور سامان
چٹانوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس خاتون کے ذکر
سے جس نے اتنے عظیم کام انجام دئے شاید ناظرین کے خیال میں ایک ایسی تصویر
کھنچ جائے جو ایک بلند قد اور رعنا خاتون کی ہو جس کی آنکھیں سیاہ اور خوبصورت ہیں
بال بکھرے ہوئے ہیں۔ عادات و اطوار مردانہ معلوم ہوتے ہیں جس کی آواز
سے ایک گونہ عزم اور مردانہ استقلال ٹپکتا ہو۔ لیکن در اصل اس خاتون میں
ہرگز ایسی صفات اور اس قسم کی وجاہت ظاہر نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک بیس سالہ دوشیزہ
تھی جس کی آنکھیں بھوری تھیں بشرہ سے شرم و حیا ظاہر ہوتی تھی۔ اس کا قد متوسط
درجے کا تھا۔ اس کی کسی ادا سے کوئی امتیازی شان نہ ظاہر ہوتی تھی۔ سوائے
اس کے کہ اس کی ذات میں عقل اور تواضع کی فراوانی تھی۔ حقیقی نیک نفسی اس

کی پیشانی سے ظاہر ہوتی تھی۔ ایک شخص نے جو لانگ سٹون گیا تھا لکھا ہے کہ "اس ظاہری پردے میں ایک ایسا جوہر قابل موجود ہے۔ جو محبت کو اعلیٰ ترین پیرایہ میں ظاہر کر سکتا ہے۔ اور یہ اس چیز کو دور کرتا ہے جس کو کسی قسم کے خوف یا گھبراہٹ سے تعلق ہو"

ستمبر ۱۸۳۶ء (مطابق جمادی الآخر ۱۲۵۲ھ) میں ایک روز سخت طوفان نمودار ہوا۔ رات ختم ہونے والی تھی۔ ایک جہاز جو شمال کی جانب سے روانہ ہوا تھا اور جس نے فادن کے جزیروں اور ساحلوں کو عبور کر لیا تھا۔ ایک سخت مصیبت میں گرفتار ہو گیا یعنی ایک تند ہوا اس کی پشت کی جانب سے نمودار ہوئی۔ یہانتک کہ دریا میں سخت تلاطم برپا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے پانی کشتی میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ انجنیروں نے سوراخ بند کر دیا تھا لیکن پانی تیزی سے بڑھتا جاتا تھا۔ تند ہوا چل رہی تھی۔ موجیں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اتنا ہنگامہ برپا کر دیتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا سمندر کے ربع مسکوں کو معدوم کرنا چاہتا ہے۔ یا یہ کہ طوفان نوح دوبارہ آیا ہے اور آیت عذاب ان لوگوں پر نازل ہوئی ہر کسی طرف سے سوائے رعد کی کڑک اور گرج کے اور کوئی آواز کان میں نہ آتی تھی۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔ اگرچہ تمام لوگ پانی نکالنے میں مصروف تھے مگر پانی کی شدت ہر منٹ زیادہ ہی ہوتی جاتی تھی جب کشتی ادھر اُدھر غوطے کھانے لگی تو اس کا سوراخ اور زیادہ بڑا ہو گیا۔ دریا کے پانی

نے انجن کی آگ کو بجھا دیا تھا۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ رسیوں کو جنھیں طوفان کے ڈر سے کھول دیا تھا پھر باندھیں۔ ٹھیک اس وقت طوفان کا نہایت شدید اور سخت حملہ ہوا۔ ہوا کی تندی نے ان پر دنیا تنگ کر دی۔ موجیں اس طرح بلند ہوتی تھیں جیسے پہاڑ۔ برف و باراں کی زیادتی حد سے بڑھ گئی تھی۔ دھند اور آندھی نے چاروں طرف سے ان کا احاطہ کر لیا تھا۔ دریا کا بہاؤ جنوب کی جانب ہو گیا تھا کشتی بے بس ہو کر بھنور میں چکر لگا رہی تھی۔ گویا خواجہ حافظ شیرازی نے سیکڑوں برس پہلے اسی کیفیت کو بیان کیا تھا۔

شب تاریک و موج بیم و گردابی چنیں ہائل کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

اب رات تمام ہو چکی تھی۔ طوفان اور آندھی قدرے کم ہوئی۔ خوفزدہ ملاحوں نے جزیرۂ فاڈن کے چراغوں کو دور سے دیکھا ایک جانب پتھریلا ساحل جو آفتوں کا گھر تھا۔ دوسری طرف متعدد خوفناک جزیرے فی الحقیقت وہ بیچارے موت کے پھندے میں پھنس گئے تھے! اور اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ پہلو کی چرخیوں کی مدد سے جہاز حرکت کرے لیکن کشتی میں پانی کی کثرت کی وجہ سے یہ بھی نہ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ جہاز کے سکّان بھی حرکت نہ کرتے تھے۔ کشتی چاروں طرف غوطے کھاتی تھی، اور کشتی والے زندگی سے مایوس ہو کر یقین کر چکے تھے یا تو جو پانی سوراخوں میں سے داخل ہو رہا ہے وہ کشتی کو غرقاب کرے گا یا وہ چٹانوں سے ٹکرا کر ایک دم ڈوب جائے گی۔ طلوعِ آفتاب میں

چند لمحے باقی تھے کہ جہاز نے چٹان سے ٹکر کھائی اور پاش پاش ہوگیا یعنی طوفان
کی شدت نے کشتی کو کسی جزیرے کے قریب لاکر پٹخ دیا۔ اور اس کے پچھلے حصے
کو ذرا اوپر اٹھاکر اس کو موت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ جہاز کے ڈوبنے سے
پہلے نو یا دس آدمی (جو اپنی جان بچانے پر تلے ہوئے تھے) ایک دخانی کشتی میں
بیٹھ کر روانہ ہوئے لیکن بہت جلد بارش اور طوفان میں گم ہوگئے۔ کپتان اور چند
افسر کشتی کے پچھلے حصے میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ بھی بالآخر غرق ہوگئے۔ کشتی
کے وسط میں جہاں پانی کم تھا چند آدمی یاس کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے اور
دریا کی موجیں بار بار ان پر یورش کرکے ان کی زندگی کو خطرے میں ڈالدیتی تھیں
سامنے کے حجرے میں ایک عورت دو بچوں کو اپنے پاس لئے غش میں پڑی
تھی جس وقت صبح ہوئی گریس ڈارلنگ نے اس ہولناک منظر پر نگاہ ڈالی۔ گرد و
غبار پانی پر چھایا ہوا تھا۔ اور اس نے جزیروں کو ایک حد تک نظر سے غائب
کردیا تھا۔ اس وقت تند ہوا چل رہی تھی اور دریا میں جہاں طوفان وابرگھرا
ہوا تھا، شور برپا تھا۔ ایک جزیرے کے کنارے کے قریب اس نے ایک میل کے
فاصلے پر دھندلی سی چیز دیکھی جو کہ غبار اور طوفان میں پنہاں تھی۔ دوربین کی
مدد سے معلوم ہوا کہ وہ غرق شدہ کشتی کا کچھ حصہ اور چند لوگ ہیں جنہوں نے
اس کے وسط میں پناہ لی ہے۔ یہ فوراً کمرے کی جانب گئی اور دوربین باپ کے
ہاتھ میں دے کر کہا "ابا دیکھئے جہاز ٹکرا کر غرق ہوگیا۔ لیکن بعض مسافر زندہ ہیں،

اور اس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس کے باپ نے جواب میں صرف اتنا کہا کیسے بدقسمت لوگ ہیں اب ان کی زندگی کی کوئی امید بظاہر باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ خدا ان ستم رسیدوں کی فریاد کو پہنچے۔ ورنہ دریا میں تلاطم ہے اور اس قیامت خیز طوفان میں کوئی شخص ان کی جان بچانے کو بھی نہیں جا سکتا۔"

اس کا باپ جری اور نڈر دل والا شخص تھا لیکن وہ بخوبی جانتا تھا کہ اگنبوٹ کے لئے ان چٹانوں کے درمیان کس قدر خطرہ ہے۔ گریس ڈارلنگ بھی ان خطروں سے پورے طور پر واقف تھی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے ان خطرات کا مقابلہ ان لوگوں کو بچانے کی امید پر کیا۔ اور مقابلۃً ان کو کوئی وقعت نہ دی۔ گریس نے آجتک چپو ہاتھ میں نہیں لئے تھے سوائے اس وقت کے جب دریا بالکل ساکت ہو۔ اور وہ اس میں بہ آسانی کھے سکے۔ اس نے اپنے باپ سے اصرار کیا کہ وہ اسے ان آفتوں میں پڑنے اور طوفان سے مقابلہ کرنے کی اجازت دیدے۔ اس نے کہا مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ بدنصیب تو غرق ہو جائیں اور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس تماشے کو دیکھوں مجھے چاہئے کہ توفیق اور امداد الٰہی سے ان کو اس مرگ مفاجات سے نجات دلاؤں۔ آخر کار باپ کو اس کی استدعا قبول کرنی پڑی۔ اور کشتی کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ گریس نے چپو ہاتھ میں لئے اور کشتی کو کھینا شروع کیا۔ کشتی کبھی اس طرف کبھی اس طرف جھک جاتی تھی۔ کبھی موجیں اس کو بلند کر دیتیں اور کبھی دریا کی تہہ تک پہنچا دیتیں۔

اس وقت دریا ابھار پر تھا۔ چند مرتبہ کشتی ادھر اُدھر ہوئی اور نزدیک تھا کہ چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو جائے۔ لیکن اسی بہادر دل اور مضبوط ہاتھوں نے جو اس کو وہاں تک لائے تھے اسے مقصد تک پہنچا یا۔ ۹ شخص جو سردی اور ہوا کی شدت سے نیم مردہ تھے صحیح سالم اگنبوٹ پر آ گئے۔ بیچاری عورت جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ایک کونے میں پڑی تھی اور اس حادثہ کی وجہ سے برائے نام ہی جان اس کے بدن میں باقی تھی۔ اس کے دونوں بچے مردہ پڑے تھے۔ ناممکن ہے کہ ہم اس خوشی اور تسکین کا تصور کر سکیں جو ان بدبختوں کو اگنبوٹ کے دیکھنے سے ہوئی ہوگی۔ اس سے قبل وہ بالکل چٹانوں کے نزدیک تھے۔ اور موجیں برابر ان پر حملہ کر رہی تھیں۔ اب کشتی ان کے نزدیک ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کو اپنے نجات دہندوں کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ ناممکن ہے کہ ہم اندازہ کر سکیں کہ وہ لوگ کس طرح حیرت اور تعجب سے بہادر گریس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوں گے کہ نہایت وقار اور متانت سے اپنے ضعیف باپ کے پاس بیٹھی ہے۔ بعض آدمی ان میں سے متاثر ہو کر رونے لگے۔ بعض حیرت اور تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ بار الہٰا! جو ہم دیکھ رہے ہیں یہ عالم خواب ہے یا بیداری! اور یہ نہایت خشوع و خضوع سے دعا اور فریاد میں مشغول تھی اور اپنے نجات دہندوں کے لئے آسمانی برکتیں مانگ رہے تھے جس وقت انھوں نے ٹوٹی کشتی کو چھوڑ دیا۔ پانی میں تلاطم برپا ہوا۔ اگر دوسری کشتی والے

ان کی مدد نہ کرتے تو قریب تھا کہ گریس اور اس کا باپ ہمیشہ کے لئے چٹانوں میں رہ جائیں۔ اگنبوٹ صحیح سالم روشنی کے مینار پر پہنچ گیا۔ شدت طوفان سے مجبور ہوکران سب آدمیوں کو دو روز وہاں ٹھہرنا پڑا۔ ایک دستہ افسروں اور ملاحوں کا بھی اس مقام پر آیا ہوا تھا وہ بھی ٹھہر گیا۔ اس طرح علاوہ گریس کے گھر والوں کے بیس آدمی اس چھوٹے منارہ میں مقیم تھے۔

اگرچہ اس وقت یہ خاتون محترمہ غیر معروف اور شہرت سے بیگانہ تھی لیکن جوں ہی انگلستان کے گرد و نواح میں یہ خبر شائع ہوئی اس کی نیکنامی کا شہرہ تمام اطراف میں پھیل گیا۔ قومی جذبات اس خاتون کی شجاعت اور ہمت کی داستان سن کر جوش میں آگئے۔ چاروں طرف اس کی اس بہادری پر صدائے آفرین و تحسین بلند ہوئی۔ نہ صرف انگلستان بلکہ تمام یورپ میں اس کی شجاعت کی داستان زباں زد خاص و عام ہوگئی۔ بیشمار تحفے اور ہدیے چاروں طرف سے اس کے پاس آنے لگے۔ منجملہ ان کے پبلک کی جانب سے سات سو پونڈ بھی جو دس ہزار روپے کے برابر ہوتے ہیں پیش کئے گئے۔ بڑے بڑے مصوروں نے منارہ پر آکر اس باہمت اور جری خاتون کی تصویریں لیں، جو مختلف جلسوں اور انجمنوں میں دکھائی گئیں۔ ایک انگلستان کے نامور شاعر نے اس کی تعریف اور توصیف میں عمدہ قصیدہ کہا۔ بعض آدمیوں نے اس کو شادی کے لئے پیغام دئے۔ اور لوگوں کے دلوں میں اس کی اس درجہ عظمت قائم ہوئی کہ انھوں نے

اصل واقعہ یعنی طوفان سے نجات دلانے والے سین کو ڈراما بناکر تھیٹر میں دکھایا۔ اور
ایک تھیٹر والے نے اس بات کی خواہش اور اصرار کیا کہ گریس خود تکلیف کر کے
آئے اور تھیٹر میں اس پارٹ کو بذات خود ادا کرے۔ اور ہر ایک رات کا معاوضہ
تین سو روپیہ لیا کرے۔ لیکن اس نے نہایت نرمی اور ملائمت سے انکار کر دیا اور
باوجود اس قدر تعریف اور شہرت کے اس مینارے سے کسی دوسری جگہ نہ گئی۔
اس واقعہ کے چند ماہ بعد مرض سرطان میں مبتلا ہوئی۔ اور اس جہان فانی سے
گزر گئی۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

(میرے مرنے کے بعد میری قبر کو زمین میں مت تلاش کرو۔ میرا مزار صاحبان
ذوق کے سینوں میں ہے۔)

اعجوبہ سائبیریا

سائبیریا ملک روس کا ایک حصہ ہے۔ وہاں کی آب و ہوا نہایت سرد اور خراب ہے یہاں تک کہ روس کی گورنمنٹ اس کو ایک محبس خاص کے طور پر استعمال کرتی ہے جو سیاسی یا ملکی مجرم ہوتا ہے وہ یہاں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ اس کی سخت سردی اور موسم کی مصیبتوں میں گرفتار رہ کر کانوں میں کام کرے جو مصیبت اور مشقت ان بیچاروں پر پڑتی ہے وہ نہ بیان میں آسکتی ہے نہ تحریر میں۔ عموماً وہاں قیدی دو تین ماہ قیام کے بعد اکثر مصیبتوں اور تکلیف کی یورش کے بعد جانبر نہ ہوتے تھے۔ بیچارے قیدیوں پر اس قدر ظلم اور سختیاں ہوتی تھیں کہ سارے روس میں سائبیریا کو دوسرا جہنم کہا جاتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ان قیدیوں میں سے کوئی اس جہنم ثانی سے فرار ہو جانا چاہتا تو تمام راستے برف سے بند ملتے اور نگہبان اس قدر ہوشیار رہتے تھے کہ قیدیوں کی رہائی صرف موت کے ذریعے ہو سکتی تھی۔ بجز اس صورت کے کہ کوئی شخص ان کی فریاد کو پہنچے اور ان کے عقدے کو وا کرے۔ ہزاروں قابل عظمت ہستیاں اس مصیبتوں کے گھر میں راہی عدم ہوئیں بلکہ ہر سال کئی ہزار آدمی اس علاقے میں ہلاک ہو جاتے تھے۔ بھوک اور سردی اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر دوسرے

جہان میں جا پہنچے۔ وہاں کی تمام زمین اُن قیدیوں کی قبروں سے بھری ہوئی تھی جو سیاسی قصوروں کی پاداش میں اپنے گھروں سے بچھڑ کر یہاں کی قبروں میں آباد ہوئے تھے۔

روس کے شرفا میں ایک شخص تھا جس کا نام پراسکوئی لاپولوف تھا اور یہ ایک عالی خاندان سے متعلق تھا۔ گزشتہ صدی کے آخر میں روس اور ٹرکی کی لڑائی میں اس نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے لیکن چند روز بعد اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے سلطنت سے بغاوت کی ہے اور بغیر اس بات کا موقعہ دیئے ہوئے کہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ حکم دیا گیا کہ وہ سائبیریا کو بھیج دیا جائے۔ بہت فریاد و زاری کی گئی لیکن کارگر نہ ہوئی اور پولوف مع اپنی بیوی اور کمسن لڑکی کے اس پُر وحشت اور ویران مقام پر بھیج دیا گیا۔ ان کو معمولی قیدیوں کی طرح غذا ملتی تھی۔ اس بیچارے نے دیکھا کہ یہ جگہ بالکل جہنم کا نمونہ ہے۔ وہاں کی زمین نو مہینے تک برف میں ڈھکی رہتی اور وہاں کے رہنے والے درحقیقت زندہ درگور یا مردہ بیرون گور ہیں گرمی کے موسم میں جو صرف چند ہی روز رہتا ہے تھوڑی سی کھیتی کی جاتی تھی۔ لاپولوف کی بیٹی نہایت خوشی اور آمادگی سے اس کام میں شریک ہوتی اور کوشش کرتی تھی کہ اپنے گھر والوں کی ضروریات ایک حد تک رفع کرے اور والدین کو راحت پہنچائے۔ چونکہ لاپولوف بھی بالکل لاچار ہو گیا تھا لہٰذا وہ

اس زندگی پر قانع ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کی لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ اس کے باپ کی دائمی بدبختی اور ماں کی پریشانی کی کیا وجہ ہے لیکن جہاں تک اس کے امکان میں تھا وہ دونوں کو تسلی دینے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی جب اس کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوئی تو اس کو علم ہوا کہ میرا باپ سیاسی مجرم ہے۔ ایک دن وہ حسب معمول اپنے کام پر جا رہی تھی اس نے دیکھا کہ اس کا باپ بہت رنجیدہ اور غمگین نظر آتا ہے۔ اس نے بادشاہ کو رہائی منظور کرانے کے لئے عرضی لکھی تھی جو نامنظور ہوئی۔ یہ معلوم کرکے لڑکی نے پکا ارادہ کر لیا کہ خود پیٹرزبرگ جائے اور اس کام میں کوشش کرے۔ اگر اس بات کو والدین سے کہتی تو یہ بات ان کو خطرناک اور بے فائدہ نظر آتی اس لئے اس نے ابھی کسی پر اس بات کو ظاہر نہ کیا۔ اکثر وہ تمام تمام دن جنگلوں میں بسر کر دیتی اور خدا سے دعا کرتی کہ بارالٰہا! مجھے اتنی ہمت دے کہ اپنے والدین سے اجازت حاصل کر لوں اور اس کام کو انجام دوں۔ وہ تمام مشکلات اور رکاوٹوں کو بخوبی جانتی تھی کہ سائبیریا سے پیٹرزبرگ تک صدہا میل کی مسافت ہے۔ اس کے علاوہ ماں باپ اتنے تنگ دست ہیں کہ اس خیال پر عمل کریں تو اس کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے لیکن وہ امیر بھی ہوتے تو بھی سائبیریا کے جنگلوں میں سفر کا سامان مہیا نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مسافر کو تمام راستہ پا پیادہ طے کرنا پڑتا تھا بالآخر اس نے بغیر کسی خوف اور رعب کے اپنے عزم کو والدین سے بیان کیا اور

درخواست کی کہ اس کو سفر کی اجازت دیں۔ لیکن انھوں نے اس طریقے سے ان خیالات کی تردید کی کہ اس لڑکی نے قریب قریب یہ ارادہ ترک کر دیا۔ انھوں نے اول تو اس کی باتوں کو صرف مضحکہ اور تمسخر خیال کیا لیکن جب دیکھا کہ اس کا عزم مصمم ہے تو اس کے والد نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ دوبارہ ہرگز ایسا ارادہ نہ کرنا۔ اسے دوبارہ اجازت حاصل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی اثنا میں اس کی ماں ایک شدید مرض میں مبتلا ہو گئی اور بہت عرصے میں شفایاب ہوئی۔ اس نے اپنی ماں کی تیمارداری کے دوران میں تکلیف اٹھانا اور صبر سے کام لینا بخوبی سیکھ لیا۔ آخر کار جب رنج اور ناامیدی سے اس کی صحت پر برا اثر پڑنے لگا تو اس کے والدین نے دل پر پتھر رکھ کے اس کو اجازت دے دی لیکن جب ان کو یہ خیال آتا تھا کہ دوبارہ اپنی بیٹی کو نہ معلوم دیکھیں گے یا نہیں؟ تو ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔ باوجود ان دقتوں اور رکاوٹوں کے اس نے وہ مسافت اختیار کی جو کسی شخص نے اب تک نہ کی تھی اور اتنی سخت سردی اور برف باری میں سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ ایک دہقان کو اس کی حالت زار پر رحم آیا اور اسے اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ چند روز بعد جب وہ سفر کرنے کے قابل ہو گئی تو فوراً ہی سخت سردی کا موسم شروع ہو گیا اور وہ مجبور ہو گئی کہ جہاں کہیں اس کو کوئی شخص پناہ دے وہ ٹھہر جائے۔ نزدیک تھا کہ تنہائی اور تکان کی وجہ سے اس کی امید یاس سے مبدل ہو جائے اور

اس کام کا سودا اس کے سر سے رخصت ہوجائے کہ اتفاقاً کاٹرن برگ میں
اس کی ایک معزز خاتون سے ملاقات ہوئی۔ یہ خاتون اس کی داستان سے
اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے اس لڑکی کو ایک جہاز میں جگہ دلادی جو نیچو سے جاتا
تھا اور دربار کے ایک صاحب اثر شخص کے نام سفارشی خط لکھ دیا۔ اس سفر
میں دریا سے ایک طوفان نمودار ہوا اور ان کا جہاز تلاطم میں آگیا۔ قریب
تھا کہ یہ غریب لڑکی ہلاک ہوجائے اور اس کے والدین کی امیدیں خاک میں
مل جائیں۔ لیکن وہ ڈوبنے کے خطرے سے بچ گئی مگر سردی کی زیادتی
کی وجہ سے سخت بخار آنے لگا۔ جبکہ نیچو سے میں پہنچی، تو اس کو ایک خانقاہ
بھیج دیا گیا۔ جہاں راہبہ عورتوں کی توجہ اور خدمت سے اس نے شفا پائی
جب وہ روانہ ہونے لگی تو خانقاہ کی افسر نے اس کا ایسا انتظام کردیا کہ برف
گاڑی میں حفاظت کے ساتھ سفر کرے۔ اس کو گھر سے روانہ ہوئے اٹھارہ ماہ
ہوگئے تھے جب وہ پیٹرز برگ پہنچی تو اس نے دیکھا کہ یہ کام نہایت مشکل معلوم
ہوتا ہے۔ وہ چند روز عدالت کے آس پاس اس امید میں چکر لگاتی رہی
کہ شاید کوئی پرسشِ احوال کرے اور اس کی حالت پہ رحم کرکے مدد دے۔
لیکن افسوس کہ اس کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ بعض نے حقارت اور نفرت سے
اس پر نظر ڈالی۔ اس کا مضحکہ اڑایا۔ جو ذرا شریف تھے انھوں نے بھی اس کو
بہت تھوڑی سی امید دلائی۔ ایک مدت تک اس کو حصول آرزو کی کوئی شکل نظر

نہ آئی۔ اور بیچاری اس عرصے میں فقرو فاقے میں مبتلا رہی۔ اور کامیابی سے ناامید ہوگئی۔ آخر ایک تدبیر بن پڑی یعنی وہ خط جو اس کی محسنہ نے لکھا تھا مکتوب الیہ کو ملا۔ اور کچھ کچھ امید بندھی۔ اس کی سرگزشت اثر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ جب اسے بادشاہِ وقت کی والدہ کی خدمت میں باریابی کی اجازت دی گئی تو اس نے نہایت سادگی سے بغیر کسی قسم کے خوف وہراس کے اپنی حالت بیان کی۔ اور خواہش ظاہر کی کہ اس کے باپ کو نہ صرف معافی دی جائے۔ بلکہ اس کے رتبے پر بحال کیا جائے۔ ملکہ اس واقعے سے متاثر ہوئیں۔ اور وعدہ کیا کہ اپنے لڑکے سے اس کے حق میں سفارش کریں گی۔ اس کے بعد جلد ہی وہ شہنشاہِ روس کی خدمت میں پیش ہوئی۔ اس نے اپنے حالات کو خود اعلیٰ حضرت کے سامنے بیان کیا۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہِ اعظم نے اس کے والد کو آزاد کردیا۔ اور کل قیود اس پر سے اٹھالیں۔ جاگیر واپس دے دی گئی۔ چونکہ شہنشاہ اس لڑکی کے اوپر خاص مرحمت کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اسے اجازت ملی کہ دو اور شخصوں کو جن کو مناسب سمجھے رہائی دلاکر اپنے ساتھ لائے۔ جس وقت یہ حکم سائبیریا میں پہنچا۔ تمام آدمی نہایت خوش ہوئے۔ لڑکی نے والدین سے درخواست کی کہ نیجنی کی خانقاہ میں آکر اس سے ملاقات کریں اور مصمم ارادہ کرلیا کہ وہاں اپنی تمام عمر بسر کرے۔ اس کے خیال میں اس نعمت کا بہترین شکریہ یہ تھا کہ اپنی زندگی عبادتِ خدا کے لئے وقف کردے۔ اگرچہ

بظاہر یہ بات قابل افسوس تھی کہ ایسی بہادر خاتون اپنا دل دنیا سے ہٹا لے
اور ایسے بہادری کے کاموں سے اپنی نوع کو فائدہ نہ پہنچائے۔ لیکن جیسے وہ
اُس کام میں ثابت قدم تھی ایسی ہی اس بات میں رہی۔ آٹھ روز میں اس کے والدین
وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی اور ۸ر دسمبر ۱۹۰۹ء مطابق
جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ میں اس جہان فانی سے سدھاری لیکن اپنی ہمت اور شجاعت
کے باعث اپنا نام ہمیشہ کے لئے صفحۂ روزگار پر چھوڑ گئی۔ اگر ان حالات کا مطالعہ
کرنے والا ذرا غور و خوض کرے، اس کام کی مشکلات اور تکلیفوں کو مجسم کر کے
اپنے سامنے لائے تو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اس بلند ہمت لڑکی نے کس درجہ
ہمت اور بہادری دکھائی اور کیوں کر اپنے آپ کو فداکاری کے خطروں میں
ڈالا۔ یہ واقعہ اس قابل ہے کہ تاریخ کے صفحوں میں سونے کے پانی سے لکھا جائے۔

فرانسس ویلارڈ مصلح اخلاق

بعض اوقات قومیں اور مذاہب بھی اشخاص کی طرح برائیوں اور قباحتوں کا مرکز ہوتے ہیں۔ مثلاً آریوں کی قوم نشہ آور چیزوں کے استعمال میں مشہور رہی قدیم ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں تقریباً ایک جلد شراب کی تعریف و توصیف سے بھری ہوئی ہے۔ ان میں یہاں تک لکھا ہے کہ ان کے دیوتا شراب سے نہایت رغبت رکھتے تھے۔ اور اندرا جو دیوتاؤں کا بھی دیوتا مانا جاتا تھا اس طرح شراب پیتا تھا جیسے ایک پہاڑی بکری جس کی جان پیاس کی وجہ سے نکل رہی ہو پانی پیتی ہے۔ اگرچہ بدھ مذہب نے ایک حد تک اس برائی کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پھر بھی بہت سے بدھ مذہب کے پیرو نشوں کا استعمال کرتے تھے انگلستان میں بھی قدیم آریا قومیں اسی طرح شراب کی دلدادہ تھیں کہ گویا ان کی خیالی بہشت کی تمام نعمتیں اور لذتیں اسی پر منحصر تھیں۔ وہ تمام دن جنگ میں مشغول رہ کر شام کو مقتولوں کی کھوپریوں میں سرخ شراب پیتے تھے۔ اب بھی اکثر مغربی ممالک میں مسکرات کا رواج بدبختی ذلت اور غربت کا باعث ہے۔ لیکن انسانی خیر خواہی کی وجہ سے بعض مردوں اور اکثر عورتوں نے ان برائیوں اور قباحتوں کو دور کرنے میں بڑی جدوجہد کی ہے۔ اور وہ نہایت

خلوص اور خواہش قلب سے اس میں کوشاں رہے ہیں کہ لوگوں میں سے یہ ادبار اور نحوست جہاں تک ممکن ہو دور کی جائے۔ ان مصلحین میں ایک امریکا کی وہ خاتون ہیں جن کا مختصر حال ہم درج کرتے ہیں۔

فرنسس ویلارڈ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۹ء مطابق ۲۹ رجادی الثانی ۱۲۵۵ھ میں نیویارک کے ضلع میں پیدا ہوئی۔ یہ میجر سیمون ویلارڈ کی نسل سے تھی جو در اصل انگریز تھے۔ انھوں نے ۱۶۳۹ء میں امریکہ کو ہجرت کی تھی۔ تاکہ اس حریت اور مذہبی آزادی کو حاصل کریں جو وطن میں نصیب نہیں تھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ بعض مذہبی اختلافات کی وجہ سے ان میں پھوٹ اور نااتفاقی پڑ گئی تھی جو گروہ سلطنت کا طرفدار تھا وہ دوسرے فرقے پر ظلم کرتا تھا۔ ان کو تکلیف پہنچاتا اور تنگ دستی میں رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگ ان مظالم سے تنگ آ گئے۔ اور ان سختیوں کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا۔ اسی سبب سے یہ ترک وطن کر کے امریکہ چلے گئے اور وہاں اپنے اپنے گروہ اور قبیلے بنا لئے اور کان کارڈ کے نزدیک (جو امریکہ کا ایک بڑا شہر ہے) ایک جگہ سنگ ساق پر اس عبارت کو نقش کر دیا "اس گاؤں میں سیموں ویلارڈ ساکن کان کارڈ نے زندگی بسر کی ہے اور چالیس سال سے زیادہ اس شہر میں مہاجرین کی خدمتیں انجام دی ہیں"، جب فرنسس کی عمر دو سال کی ہوئی تو اس کے والدین اوبرلین

چلے گئے تاکہ وہاں سکونت کرنے سے پہلے پانچ سال دارالفنون میں تعلیم پائیں۔
جب یہ سات سال کی ہوئی تو یہ تمام لوگ سہواگوں میں جہاں مہاجرین رہتے تھے چلے گئے۔ آخرکار جان سویل جو ویکان سین کے قریب ہی وہاں پہنچے اور نہر کے کنارے مکان بنا کر دہقانوں اور صحرا نشینوں کی طرح رہنے لگے۔ اس کنبے میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ یہ سب اس طرح تندرست اور صحیح رہتے اور بیماری کمزوری سے بچے ہوئے تھے۔ گویا نقاہت اور مرض کو جانتے ہی نہ تھے اور کبھی ان چیزوں کو دیکھا ہی نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کو حفظ صحت کے بہت سے مفید اور نافع قواعد معلوم تھے۔ اور وہ ان پر عمل کرتے تھے۔ فرنسس ویلارڈ ان قوانین کی عمدگی اور خوبی کی اس قدر قائل تھی کہ اس کو خیال تھا کہ ان سب کو لکھ کر ہر گھر کے دروازے پر لٹکا دینا چاہئے۔ وہ قواعد یہ ہیں۔
سادہ غذا کھاؤ۔ پوری نیند سوؤ۔ رات کو سویرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ تمام سال نیچے کا لباس ہلکا پہنو۔ پاؤں گرم اور سر ٹھنڈا رکھو۔ تنگ لباس نہ پہنو ورزش کرو۔ مکان ایسا بناؤ جس میں ہوا اور دھوپ اچھی طرح داخل ہو سکے بچوں کو کبھی چائے یا قہوہ نہ دو۔ سگرٹ، حقہ کو گھر میں داخل بھی نہ ہونے دو۔ اور نہ کسی شخص کی اس سے مدارات کرو۔ سچ بولو۔ والدین کا ہر امر میں خیال رکھو
اس کنبے کے بچوں کو ایسی تربیت دی گئی تھی کہ پالتو جانوروں تک سے محبت کرتے تھے۔ ان بچوں کی والدہ ایک عقلمند اور متین خاتون تھیں انکی طبیعت

شاعری کی جانب مائل تھی۔ انھوں نے ایسے اشعار دل پذیر نظم کئے کہ تمام اطراف میں پھیل گئے۔

بارہ سال نہایت خوش خرم دلیکاکین میں گزارے۔ اس وقت فرنسس ویلارڈ نے اپنی پوری توجہ تعلیم و تدریس پر رکھی اور اپنی ہمت کو تحصیل علم پہ صرف کر دیا۔ انیس سال کی عمر میں زنانہ کالج واقع اوانسٹن میں داخل ہوئی اور بہت جلد اپنی ہم سبق لڑکیوں سے بڑھ گئی، اور ان میں ممتاز درجہ حاصل کر لیا۔ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نہایت کامیابی کے ساتھ اعلیٰ سند حاصل کی۔ اس کی تحصیل علم کا بڑا مقصد معلمی کے پیشے کو اختیار کرنا تھا۔ آخر اس کو ایک مدرسہ میں جو آبادی سے دور جنگل میں واقع تھا بھیج دیا گیا۔ تاکہ سرکش اور بدمزاج بچوں کی تربیت کرے۔ درحقیقت اس کے یہ شاگرد بالکل جامۂ انسانیت سے باہر اور آدمیت سے خارج تھے۔ اور اس قدر فضول خرچ جھگڑالو اور شریر تھے کہ مدرسہ کا زیادہ تر وقت جھگڑنے لڑنے اسکول کی کھڑکیاں توڑنے میں صرف کرتے تھے۔ ان میں ادب اور نظم قائم کرنا ایک نہایت مشکل اور تکلیف دہ امر تھا لیکن اس خاتون نے نہایت صبر اور استقلال سے کام لیا۔ اپنے فرض سے بالکل جی نہ چرایا اور نہایت محنت سے ان کے نقص اور عیب دور کرنے کی کوشش میں مشغول ہوئی۔ ایک روز اس نے ایک شاگرد کو دوسرے سے یہ کہتے سنا "ہم کو چاہیئے کہ نیک اور شریف بننے کی

کوشش کریں۔ ہماری معلمہ نے ہدایت کی ہے کہ ہم معزز اشخاص کی مانند رفتار و گفتار اختیار کریں"۔ جب اس نے یہ بات سنی تو اس کی طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اور اس اظہار نے اس کو اور زیادہ شوق اور ترغیب دلائی۔ چند سال کے بعد اس کو ایک بہت بڑے زنانہ کالج کا انتظام سپرد کیا گیا۔ یہ پہلی خاتون تھی جس کا ایسے بڑے عہدے پر تقرر کیا گیا۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ اپنی شاگردوں کو فرماں برداری اور اطاعت سکھائے۔ یعنی ایسی تدابیر اختیار کرے کہ وہ ہمیشہ اپنے ضمیر کی پابند رہیں اور جو کام انسانیت کے خلاف اور منافی ہیں، ان کی کبھی مرتکب نہ ہوں۔ اگرچہ اس نے ان کے لئے چند ہی جزوی قانون بنائے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک جماعت قائم کی جس کا نام "صالحات" تھا۔ خوش اخلاق طلبہ اس جماعت میں داخل ہوتے تھے اور شرافت اور پاس ادب کی وجہ سے مشہور ہو جاتے تھے جو عہد اس جماعت کے اراکین سے کئے جاتے تھے وہ یہ ہیں۔ "میں عہد کرتی ہوں کہ ایسا سلوک اپنے شاگردوں سے کروں گی کہ اس کے بعد اگر وہ میرے طریقے پر چلیں تو ہمارے مدرسے کو کسی قانون کی ضرورت ہی نہ رہے۔ بلکہ ہر ایک اپنے حالات کا خود ہی محاسب ہو جائے۔ اور میں یہ بھی عہد کرتی ہوں کہ ہمیشہ ان باتوں کا معمول رکھوں گی جن سے راحت اور امن قائم رہتا ہے"۔

اس خاتون نے اپنی شاگردوں کو یہ بتایا کہ وہ اپنی مخصوص نیک

عادتوں اور خیالات کو ہر دم پیش نظر رکھیں۔ چونکہ وہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتی تھی
اور تمام ضروری کاموں کی تاکید کرتی رہتی تھی اس لئے ان سب کو احساس ہوا
کہ اگر وہ خلوص نیت اور صدق عقیدت سے اس کی نصیحتوں پر عمل کریں گی، تو
ضرور سرخروئی اور ترقی نصیب ہو گی۔

۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۱ھ تک اس نے اوسٹن میں نہایت عظیم الشان
خدمات اور کار ہائے نمایاں انجام دئے۔ لیکن اس سال مدرسہ کے افسروں اور
اہالی دار الفنون کے درمیان کچھ جھگڑے پڑ گئے۔ جن کی وجہ سے فرنسس کو اپنی
مرضی کے خلاف استعفا دینا پڑا۔ بہت بڑی بڑی جگھوں اور مختلف مقامات سے
اس کے بلانے کے پیغام آئے جو اس کی شرافت اور عزت کے اعتبار سے اس کیلئے
ہر طرح قابل قبول تھے۔ اس کے دوست احباب بہت اصرار کرتے کہ ان عہدوں
کو قبول کرے۔ دوسری جانب ان لوگوں نے جو ملک میں دینداری پھیلانے
اور نشہ آور اشیا کے خلاف جنگ کرنے میں کوشاں تھے استدعا کی کہ ان
کی افسری کا عہدہ قبول کرلے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس سے تھوڑے عرصہ قبل
ایک جماعت خواتین امریکہ کی شراب اور دیگر فضول اشیا کے سدباب کرنے کے
لئے قائم ہوئی تھی۔ اس کے مختلف دستے بازاروں اور گلیوں میں گشت کرتے تھے
اور ان چیزوں سے پرہیز کرنے کے فوائد لوگوں سے بیان کرتے تھے۔ ان مکانوں
اور شراب خانوں کے سامنے جو اس کے لئے مخصوص تھے ایسے اشعار اور

نظمیں جن میں ان کی برائیاں ہوتیں پڑھتے تھے اور نہایت اصرار اور منت سے لوگوں کو باز رکھنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے شراب فروشوں نے اپنی دکانیں بند کر دیں اور اس کام کو ترک کر دیا۔ پچاس روز کے اندر اندر اس جماعت نے چالیس شہروں اور پچاس قصبوں کا دورہ کیا۔ اس جماعت کے کاموں کی اہمیت نے مس ویلارڈ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ان کے خلوص کی قائل ہوگئی اور اس نے اس عہدے کو قبول کر لیا۔ اس کی بابت اس نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے "ضرور ہے کہ بجائے صلح اور امن کے میں جنگ و جدل میں شرکت کروں اور بجائے وطن کی لذتوں اور حلاوتوں کا لطف اٹھانے کے جس کو مجھ سے زیادہ کوئی دوست نہیں رکھتا، چاہئیے کہ تمام جہان میں آوارہ اور سرگشتہ پھروں مجکو لازم ہے کہ عام قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں جاؤں۔ تربیت یافتہ شریف اشخاص کی صحبت میں بیٹھنے کے بجائے چھٹے ہوئے کمینہ لوگوں کی صحبت قبول کروں"۔

خاتون موصوفہ خواتین کی اس اصلاحی جماعت کی سرگروہ تھی جس نے شکاگو میں جنم لیا تھا۔ وہ ان کاموں کی اشاعت میں یہانتک محنت و مشقت کرتی تھی کہ اکثر اوقات بھوک پیاس کی تکلیف میں گرفتار ہو جاتی تھی اور تنگ دستی کی وجہ سے گاڑی کا کرایہ تک نہ دے سکتی تھی اور کئی کئی میل پا پیادہ سفر کرنے کی تکلیف اٹھاتی لیکن زیادہ دقتیں جو اس پر وارد ہوئیں اس وجہ سے تھیں کہ وہ کسی کو اپنے حال سے مطلع کرنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن چند مہینوں کے بعد ایسے واقعات پیش

آئے کہ مس ویلارڈ کی احتیاجات رفع ہوگئیں۔

مس ویلارڈ نے اس جماعت کی سرگروہ بن کر امریکہ میں ہر جگہ کوشش کی کہ لوگوں کو تربیت دے اور متحد کرے۔ بیشمار لوگوں کو ترغیب دی کہ مسکرات کے استعمال سے ہاتھ کھینچیں، اور اس جماعت میں شامل ہوں۔ یہ اپنی پوری توت اس بات پر صرف کرتی تھی کہ لہو و لعب کے سامان کی خرید و فروخت بند ہو جائے ہرچند شراب فروش تاجر ہر جگہ ان باتوں کی مزاحمت اور مخالفت کرتے تھے لیکن اس جماعت نے بہت زیادہ ترقی کر لی تھی سنہ ۱۸۸۳ء میں اس خاتون نے ایک نہایت مشکل لیکن مفید کام انجام دیا۔ اور ایک بڑی انجمن جس کا نام "انجمن زنانِ عیسوی برائے ترک مسکرات"، تھا ترتیب دی۔ مس ویلارڈ کا بیان تھا عورتوں کو اپنا کام ایک ہی علاقے میں محدود نہ رکھنا چاہئے۔ بلکہ تمام دنیا میں اپنا اثر پھیلانا چاہئے اور انکے ورد زبان یہ کلمہ ہونا چاہئے کہ "تمام دنیا ہمارا وطن ہے اور پرہیزگاری ہمارا مذہب"۔ سنہ ۱۸۸۹ء مطابق سنہ ۱۳۰۶ھ میں مس ویلارڈ نے ایک کتاب "میری پچاس سالہ زندگی"، کے عنوان سے تصنیف کی اور جس میں اپنے حالات کو بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا ان تمام جیتے جاگتے حالات کو مشاہدہ کرتا ہے جو اس کے طفولیت کے زمانے سے طالب علمی کے زمانے تک پیش آئے اس کے بعد اس کو معلمی کی جانب مائل پاتا ہے۔ پھر کیا دیکھتا ہے؟ یہ کہ پرہیزگار جماعت کی سرگروہ ہے اور سیاسی امور میں دخل دیتی ہے۔ اور لنڈن میں ایک

عمدہ مکان اس کے لئے بنایا گیا۔ اس کی والدہ نے جو ایک معمر بزرگ تھیں، وہیں زندگی بسر کی۔ معاونین ویلارڈ اس مقام پر جمع ہوتے تھے۔ مس ویلارڈ نے ان زحمتوں کی وجہ سے جو امریکہ کے عرض و طول میں گشت کرنے سے اٹھائیں، اپنے قوائے جسمانی کو کمزور کرلیا تھا۔ اس نے ۱۸۹۲ء میں انگلستان کی جانب سفر کیا۔ اس کا استقبال نہایت اہتمام سے کیا گیا، لوگ کوشاں تھے کہ وہ اب انگلستان سے واپس نہ جائے۔ دفعتاً اس کی طبیعت معمول سے زیادہ بگڑ گئی اور وہ ایسے مرض میں مبتلا ہو گئی جس نے جان لے کر چھوڑا۔ لیکن اس نے اپنی عمر کے آخری لمحوں میں بھی ہمت افزائی کے خطوط اپنے رفقا اور دوستوں کو لکھے اور ان کو جوش دلاتی رہی۔ مس ویلارڈ نے سن ۱۸۹۸ء میں اس جہان سے رحلت کی۔

سسٹر دورا، ایک رحم دل خاتون

انگلستان کے نواح میں ایک علاقہ ہے جو "سیاہ سرزمین" کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کے تمام باشندے مزدور اور کان کھودنے والے نہایت محنت اور مشقت سے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی تمام عادات و اخلاق انسانیت سے معرا ہیں۔ اور بدبختی بے سامانی ان پر محیط ہے۔ اس کے شہروں میں ایک قصبہ "وال سال" ہے جس میں شاید ہی کوئی شخص اپنی خوشی اور رغبت سے رہتا ہو سوائے اس کے کہ ضروریات اس کو مجبور کریں، اس تیرہ و تار شہر کے وسط میں ایک مرمریں مجسمہ نصب ہے جس وقت یہ مجسمہ آندھی، غبار، دھویں اور تاریکی برف و بارش میں بجلی کی روشنی میں چمکتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک فرشتۂ رحمت ہے جو اس سیاہ علاقے پر نازل ہوا ہے تاکہ ظلمت اور تاریکی کا پردہ چشم زدن میں چاک کر کے اس اندھیر نگری میں اجالا کر دے۔ اور وہاں کی سیاہی کو روشنی میں مبدل کرے۔ یہ مرمر کی شبیہہ مس ڈورا پیٹین کی ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مارک پیٹین کی بہن تھی۔

مس پیٹین ایک انگریز پادری کی بیٹی تھی۔ وہ نہایت خلوص سے اُن فقیروں اور ضعیفوں کی خدمت کرتی جو اس کے محلہ میں رہتے تھے اور ان سے نہایت

زمی اور مہربانی سے پیش آتی تھی۔ اس کا اور اس کی بہن کا معمول تھا کہ روزگوشت اور خشک میووں کے برتن غریبوں اور محتاجوں کے گھروں پر لے جاتی تھیں۔ وہ قرب وجوار کے دیہاتیوں کو مہربانی اور محبت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس خاتون کی ذات ایسی پاکیزہ اور طبیعت اس قدر عمدہ تھی کہ وہ اپنی مہربانی اور عنایت کی وجہ سے مرجع خلق ہوگئی اور سب کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد جس کے ساتھ وہ محبت اور نیکی سے پیش آتی تھی، ایسے موقع پر بیمار پڑا جب وہ شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ لڑکا فرطِ محبت کی وجہ سے خلوص دل سے دعا کرتا تھا کہ جب تک اس خاتون کو ایک بار نہ دیکھ لے موت نہ آئے۔

جس روز اس کی حالت بہت نازک ہوئی اسی روز مس سلیٹین واپس آئیں یہ لڑکا اپنے بستر پر لیٹا ہوا اپنے کان گاڑی کی آواز پر لگائے ہوئے تھا۔ دفعتہً قبل اس کے کہ کوئی شخص گاڑی کی آواز سنے اس نے اس کو پہچان لیا، اور پکار کر کہا" وہ آگئی ہیں، الحمدللہ مس ڈورا آگئیں"۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہی بات تھی۔ اس نے ٹھیک پہچانا تھا۔ مس ڈورا وہاں پہنچی اور اس کی زندگی کی چند باقی ماندہ گھڑیوں میں برابر تسلی تشفی کرتی رہی۔

مس سلیٹین صحرائی زندگی اور دیہقانی معاشرت سے بہت محبت رکھتی تھی سوائے اس کے ایسے عشق تھا چونکہ حسن اور علم وکمال سب باتوں میں کامل تھی لہذا بہت سے معزز لوگ شادی کے خواستگار ہوئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کیا تعجب

کی بات نہیں ہو کہ ایک ایسی حسین اور تربیت یافتہ دوشیزہ جو اچھے خاندان سے ہو، اپنی زندگی دنیا کے کثیف ترین شہر میں اس کے بدترین باشندوں کے درمیان بسر کرے۔ اگرچہ ایسے کام خلاف قیاس ہوتے ہیں مگر مس ڈورا نے عمداً اپنی زندگی اپنے ہم جنسوں کی خدمت، فقیروں کی دست گیری، اور ضعیفوں کی اعانت کے لئے وقف کر دی تھی۔ زندگی کی بڑی بڑی نعمتوں اور لذتوں کے بجائے تکلیف اور دقتوں کو اختیار کر لیا تھا۔ جب اس نے تیمارداری کا کام سیکھ لیا تو ۱۸۶۵ء مطابق ۱۲۸۲ھ میں وال سال میں جا کر وہاں کے ہسپتال کی منتظم بن گئی یہ ہسپتال بعض دیندار خواتین کے ہاتھ میں تھا جنھوں نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کی اراکین سسٹرز (بہنیں) کہلاتی تھیں۔ جب مس سٹین اس جماعت میں داخل ہوئی تو اس کا لقب بھی سسٹر ڈورا ہو گیا۔

ایک رات سسٹر ڈورا اندھیرے کوچہ میں کسی مریض کی عیادت کے لئے جا رہی تھیں تاکہ اس کو مرض کے پنجہ سے نجات دلانے کی کوشش کرے کہ ایک لڑکے نے محض شرارت سے پتھر مار کر اس کی پیشانی کو زخمی کر دیا لیکن یہ بغیر کسی فریاد کے یا مواخذہ کرنے کے چپ چاپ چلی گئی۔ چند روز گزرنے کے بعد اس شہر میں کوئی جھگڑا ہو گیا جس میں چند آدمی مجروح ہو گئے۔ ان مجروحین میں جو شفاخانے میں لائے گئے وہ شریر لڑکا بھی تھا جس نے ان کے پتھر مارا تھا۔ سسٹر ڈورا نے اس کو فوراً پہچان لیا اور اپنی نیک دلی کی وجہ سے جو اس

کی فطرت میں شامل تھی۔ اس پر خاص توجہ اور نگرانی رکھی۔ جب وہ لڑکا روبہ صحت ہوا تو اس نے خدا کا بہت شکر ادا کیا۔ وہ لڑکا اس محبت اور مہربانی کو دیکھ کر جو اس کی گستاخی اور شرارت کا معاوضہ تھی، نہایت نادم اور شرمندہ ہوا۔ ایک رات جب سسٹر ڈورا اس کے کمرے میں گئیں تو دیکھا کہ وہ لڑکا رو رہا ہے۔ جب رونے کا سبب دریافت کیا تو لڑکے نے ان کے پیشانی کے زخم کی جانب اشارہ کیا اور نہایت افسوس سے کہا کہ یہ میرا ہی لگایا ہوا زخم ہے۔ اس نے جواب میں کہا "تعجب ہے تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں نے تمھیں پہچانا نہیں ہے! لڑکے نے کہا کہ آپ نے مجکو پہچان لیا اس کے باوجود بھی مجھ پر یہ نوازش کی اس بات نے مجھ کو حد سے زیادہ پشیمان کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لڑکا ہمیشہ اس خاتونِ محترم کا ممنون احسان رہا اور اس کی بے اندازہ انسانیت اور ہمدردی کے گیت گاتا رہا۔ ایک سب سے بڑا وصف سسٹر ڈورا میں یہ تھا کہ یہ اپنے مریضوں کے ساتھ جو اس کی نگرانی میں ہوتے تھے نہایت بشاشت اور خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی اور ہمیشہ ان کی خوشی اور خواہش کو مدنظر رکھتی تھی۔ ایک آئر لینڈ کا رہنے والا شخص جو کچھ عرصے اس کے شفا خانہ میں رہا تھا اور اس کے الطاف بے پایاں سے بہرہ مند ہوا تھا۔ اس کی تعریف میں کہتا تھا کہ وہ اتنی خوش مزاج ہے کہ انسان کو مرتے دم بھی ہنسا دیتی ہے۔" ایک دفعہ وال سال میں وبا پھیل گئی۔ وہاں کے بہت سے باشندے راہی عدم ہوئے۔ اس زمانے

میں مسٹر ڈورا پر بہت سخت محنت اور مشقت آپڑی۔ تمام شہر میں گشت لگا کر مریضوں کی خبر گیری کرتی تھی۔ اس وقت اس سے کہا گیا کہ ایسے بیمار کی تیمارداری کرے جو اس مرض کی خراب ترین حالت میں مبتلا تھا بلکہ تقریباً حالت نزع میں تھا۔ اس بدبخت کے تمام دوست اور رفقا اس کو چھوڑ گئے تھے اور اس سے بالکل علیحدہ ہو گئے تھے لیکن اس فرشتہ صفت خاتون نے اس کی طرف سے منہ نہ موڑا اور نہایت درجہ جرأت سے کام لے کر وہاں پہنچی، دیکھا کہ شمع کا ایک نہایت چھوٹا سا ٹکڑا جل رہا ہے، اور قریب ہے کہ ختم ہو جائے۔ مریض بیچارے نے جو حالت نزع میں تھا آنکھیں کھول کر اس کو پہچانا اور مطمئن ہو گیا۔ وہ اس کو بہت تسلی تشفی دیتی رہی، یہاں تک شمع تمام ہو گئی اور مریض بیچارے نے بھی اپنی زندگی کی گھڑیاں ختم کر دیں۔

مسٹر ڈورا کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہ خاتون ہمیشہ اپنے کنبہ اور متعلقین کو نماز و عبادت کی تاکید کرتی رہتی تھی۔ اور نہایت زور سے کہتی کہ اگر وہ اشخاص جو شفاخانہ کے کام میں مشغول ہیں دینی خدمات پوری طرح انجام نہ دینگے تو ان کے کام میں خیر و برکت نہ ہوگی۔ زخمیوں اور بیماروں پر اس وقت تک متوجہ نہ ہوتی جبتک خدا کی درگاہ میں رجوع کر کے یہ دعا نہ مانگتی کہ "خدایا اس کو اپنی رحمت سے شفا عنایت فرما"۔ اگر کسی مریض کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑتی تو خدا سے دعا کرتی کہ "بار الہا! ان کو سالم کر دے"۔

یہ خاتون جس قدر پاکدامن اور نیک دل تھی اسی قدر عقلمند اور ہوشیار تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک جوان کو شفاخانہ میں لائے جس کا بازو انجن میں آگیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کا ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔ سسٹر ڈورا نے کہا کہ حتی الامکان کوشش کرنی چاہیئے شاید اس کا ہاتھ بغیر عمل جراحی درست ہو جائے۔ اور کاٹنے کی ضرورت نہ رہے۔ آخر کار ڈاکٹر نے اس کی اجازت دے دی کہ کوشش کی جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص کا ہاتھ بالکل صحیح سالم ہو گیا۔ یہ اس کا داہنا ہاتھ تھا۔ جو حسن اتفاق سے درست ہو گیا۔ روزی کمانے کے لئے اس کے سالم ہونے کی بیحد ضرورت تھی۔ اس معاملے کے مدتوں بعد ہر یکشنبہ کو وہ جوان مکان سے جو وہاں سے گیارہ میل تھا آتا اور نوکر سے کہتا تھا کہ میرا سلام اپنی بیگم کو پہنچاؤ اور مزاج پرسی کے بعد عرض کرو کہ میں آپ کا دروازہ اپنے داہنے ہاتھ سے کھٹکھٹا رہا ہوں۔

مندرجہ بالا سطور میں اس کی زندگی کی چند قابل ذکر باتوں کا بیان ہے۔ وہ ۱۸۷۸ء میں سخت ترین مرض سرطان میں مبتلا ہوئی اور اس جہان فانی سے گذر گئی۔ آخر دم تک اُسے دوسروں کو آسائش پہنچانے اور راحت دینے کا خیال رہا۔ اس کے حسن اخلاق اور پسندیدہ عادات نے لوگوں کو اتنا گرویدہ کر لیا تھا کہ وال سال کے کاریگر آج تک اس کا ذکر خیر کرتے ہیں۔ اور انھوں نے چندہ کر کے اس کا مجسمہ وہاں نصب کر دیا ہے۔

مس ویٹلے

اس مضمون کے موضوع کو واضح کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حصے میں مصر کے حالات بیان کئے جائیں، کیونکہ وہ اس کے حالات سے ربط رکھتا ہے۔

مصر دنیا کے مشہور ترین اور قدیم ترین ملکوں میں ہے جن کا تاریخ پتہ دیتی ہے۔ جس زمانے میں ہندوستان کے باشندے محض وحشی اور جاہل تھے مملکت مصر بعض خاص وجوہ سے تمدن میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کر چکا تھا عالیشان عبادتگاہیں اور بلند عمارتیں اس میں بنائی گئی تھیں۔ اب تک ان کے آثار روئے دنیا کو حیرت میں ڈالتے ہیں۔ مصر کی حکمت تمام دنیا میں مشہور تھی اس سے پہلے یونانیوں نے اور ان سے رومیوں نے اختیار کیا اور اس طرح اس کا اثر ممالک مغربی میں پھیل گیا۔ اس کی ہوا کی خشکی کی وجہ سے جو تصویریں چار ہزار قبل کی ہیں، اب تک تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ جن مردہ جسموں کو مومیائی کر دیا گیا ہے وہ اب تک باقی اور موجود ہیں۔ ملک مصر شمالی افریقہ میں ہے اور اس کی مشرقی حدود سے بحر روم تک پھیلا ہوا ہے۔ بحر احمر اس کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کے مغرب میں صحرائے لیبان ہے۔ اس کو نہر سوئیز ایشیا سے ملحق کرتی ہے۔ مصر کا سب سے عمدہ

حصہ کوہستانی علاقہ اور پتھریلی زمین ہے جو کہیں سے پست اور کہیں سے بلند ہو اور اس طرح دروں کی شکل بن گئی ہے۔ کبھی کبھی اس میں پانی بھی جاری ہو جاتا ہے۔ مصر کی مزروعہ زمین کی ناپ تقریباً بارہ ہزار میل کی گئی ہو اور بنجر رقبہ چار لاکھ میل مربع تخمینہ کیا گیا ہو۔ دریائے نیل افریقہ کا سب سے بڑا دریا اور دنیا کی مشہور نہروں میں سے ہو۔ یونان کے پہلے مورخ ہیروڈوٹس کے مصر آنے سے دو ہزار تین سو برس قبل بھی دریائے نیل کا منبع مخفی تھا۔ اس وقت سے ابتک دنیا کے علما فضلا اس معمہ کے حل کرنے کے شائق اور کوشاں رہے ہیں۔ نیرو شہنشاہِ روم نے دو مرتبہ سیاح بھیجے کہ منبع کو معلوم کریں۔ لیکن وہ لوگ اگرچہ اس مقام سے آگے نکل گئے۔ مگر مقصد حاصل نہ ہوا۔ اسی طرح یورپ کے عقلا بھی اس عقدہ کو کھولنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مشہور انگریزی سیاح اسٹانلی اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوا۔ مصر کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہاں کے اکثر حصوں میں کبھی بارش نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہاں کے بعض باشندوں نے مدت العمر بارش دیکھی ہی نہیں۔ اس حصہ مصر کو بالائی مصر کہتے ہیں۔ لیکن مصر کے نشیبی حصہ میں بارش ہوتی ہے اور سبزی بھی پیدا ہوتی ہے۔ درۂ مصر بالکل جنگل ہے۔ اگر نخلستان کے علاوہ اور کوئی درخت نظر آئے تو اس کو ایک تعجب خیز منظر سمجھا جاتا ہے۔ انجیر۔ خرما۔ انار۔ سنگترہ۔ تربوز اس قطعہ میں زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں کے غلے گیہوں مکئی اور جو ہوتے

ہیں۔ اور چنے کو بھی غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ روئی بہت پیدا ہوتی ہے اور نہایت عمدہ قسم کی ہوتی ہے۔ یہ ملک کی ثروت کا باعث بھی ہوتی ہے اس جگہ شکار (چرغ) گیدڑ اور لومڑی کا ہوتا ہے۔ باربرداری کا کام اونٹ اور خچر کرتے ہیں۔ گائے بیلوں کو کھیتی کے کام میں لگاتے ہیں مصری لوگ بھینس کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ مگر حال میں دیگر ملکوں سے آئے ہیں۔ بکریاں، بھیڑیں بہت تعداد میں ہیں۔ کتے اور شکاری پرند بھی بہت ہیں۔ نہایت خطرناک سانپ اور اژدہے بھی پائے جاتے ہیں اور شہتوت کے پتوں میں ریشم کے کیڑوں کو بھی پالا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ مصر پہلا ملک ہے جس میں بہت قبل تمدن کی روشنی اور تربیت پھیلی۔ پرانے زمانے کے بہت سے حالات ان قدیم عبادتگاہوں اور پرانی عمارتوں سے معلوم ہوتے جو وہاں ایجاد ہوئیں۔ قدیم مصری باشندے نیم وحشی تھے، لیکن انھوں نے بتدریج ترقی کی اور ان کے گھر اس قسم کے ہونے لگے جیسے اب مصر میں پائے جاتے ہیں۔

مصر میں سب سے پہلے ایک قسم کی کتابت تصویروں میں ایجاد ہوئی جس کا نام ہیروگلیفک ہے جس سے اظہار خیال کے لئے کام لیا جاتا تھا۔ انھوں نے رفتہ رفتہ اس کو اور بھی عمدہ اور مکمل کر لیا۔ دیگر مذاہب کی طرح (سوائے یہود کے) مصریوں کے بھی بہت سے دیوتا ہوتے تھے۔ اور ان

کے علیحدہ علیحدہ نام اور خدمات مقرر تھیں۔ چار ہزار سال قبل مسیحؑ رسم تھی کہ مردہ نعشوں کو مومیائی کرکے رکھتے تھے۔ اور بعض ایسی کتابیں بھی ہاتھ آئیں جن میں آثار قدیمہ اور پرانے زمانے کی خبریں مندرج ہیں۔ پانچ سو چھبیس سال قبل مسیح کامبیز بادشاہِ ایران نے مصر کو فتح کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے پلوسیم کو جو ایک مشہور شہر ہے فتح کرنے کا ارادہ کیا تو شکاری کتوں اور بلیوں کو اپنے لشکر کے ساتھ لے لیا۔ چونکہ یہ حیوانات مصری باشندوں کے نزدیک مقدس اور محترم تھے۔ اس لئے انھوں نے ان پر حملہ کیا اور جلد مغلوب ہو گئے اس کے بعد کامبیز نے ان کی مقدس گائے کو جس کا نام آپیز تھا مار ڈالا۔ اور مصر کی قدیم عبادتگاہوں کو مسمار کر دیا۔

سنہ ۶۴۰ء میں مسلمانوں نے مصر کو فتح کیا اور جب سے اب تک مصر اسلامی سلطنتوں میں شمار ہوتا ہے۔ سنہ ۱۸۰۵ء میں محمد علی جو ایک البانوی جنرل تھا سلطان ٹرکی کی جانب سے مصر کی پاشائی پر متعین ہوا۔ یہ شخص نہایت ذہین اور ہوشیار تھا۔ اس نے بتدریج پورے اختیارات حاصل کرلئے اور جو لوگ اس کی راہ میں حائل تھے ان کو دور کر دیا۔ سنہ ۱۲۴۷ھ میں اس کے بیٹے ابراہیم نے شام پر قبضہ کرلیا۔ عکہ اور دمشق فتح کرنے کے بعد حلب میں عثمانی لشکر کو شکست دی اور قونیہ میں آٹھ ہزار ترک سپاہیوں کو شکست دے کر پسپا کر دیا۔ اور ان کے افسر کو جو عثمانی وزیر اعظم تھا گرفتار کرلیا۔ مصر کے فتحیاب لشکر کے

اسلامبول پہنچنے میں چھ منزلیں باقی تھیں کہ روس نے فریقین کے درمیان مداخلت کی۔ اوران میں معاہدہ کرادیا۔ یہ قرار پایا کہ شام کا علاقہ محمد علی پاشا کی حکومت میں رہے اوراس کے معاوضے میں محمد علی ہرسال سلطنت عثمانیہ کو خراج ادا کیا کرے۔ لیکن بعد میں بعض سیاسی وجوہات سے شام واپس کردیا گیا محمد علی پاشا نے بہت سی اصلاحات کیں اوراپنی حکومت کا انتظام درست کیا۔ کارخانے جاری کئے۔ عمدہ مدارس بنوائے۔ چھاپے خانے قائم کئے۔

قدیم اہل مصر دہقان اور فلاحین ہیں اور بہت محنت ومشقت کے عادی ہیں وہ اگرچہ بلند وبالا نہیں ہوتے تاہم خوش اندام اور قوی ہیں۔ ان کی صورتیں گول ان کا رنگ گندم گوں ہوتا ہے۔ ان کے بچے عام طور پر میلے کچیلے ہوتے ہیں۔ بعض والدین اپنی انتہائی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ صاف ستھرے اور خوبصورت بچوں کو نظر لگ جاتی ہے۔ لہٰذا صفائی کے بارے میں غفلت کرتے ہیں بعض اوقات انکے بچے اندھے ہوجاتے ہیں۔ وہاں اسلامی قوانین جاری ہیں اور قاہرہ میں جو مصر کا دارالخلافہ ہے۔ ایک مشہور یونیورسٹی جامعہ آزہر ہے، جہاں اسلامی علوم و فنون قدیم وجدید کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ یونیورسٹی اسلامی تعلیم گاہوں میں بزرگ ترین اور قدیم ترین تعلیم گاہ ہے۔ مصر کے عجائبات میں سے وہاں کے درویش بھی ہیں جو درویشی میں حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

ان کی رسموں میں سے ایک رسم "دوسہ" ہے اسکی تفصیل یہ ہے کہ درویش جمع ہوکر بہت قریب قریب ملے ہوئے لیٹ جاتے ہیں۔ اور اپنے پاؤں پھیلاکر ہاتھوں کو پیشانی کے اوپر رکھ لیتے ہیں اور کلمہ "اللہ" کو بار بار کہتے ہیں۔ پہلے ایک درویشوں کا دستہ باجا بجاتا ہوا اور لفظ "اللہ" کو بار بار کہتا ہوا ان کے اوپر سے گذر جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کے گروہ کا شیخ گھوڑے پر سوار وہاں آتا ہے اور اگرچہ گھوڑا اس سے جھجکتا ہے کہ انسان کے بدن پر سے گزرے لیکن دو آدمی اس کی لگام کو پکڑ لیتے ہیں اور ان لیٹے ہوئے آدمیوں پر سے اس کو گزارتے ہیں۔ اور لوگ نہایت شادمانی اور خوشی کے ساتھ "اللہ، اللہ" کی صدا بلند کرتے ہیں، جب شیخ گذر جاتا ہے تمام درویش اٹھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں درویش تو یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم تعویذ اور عملیات کی برکت سے بالکل صحیح سالم رہتے ہیں اور آدمیوں کے بدن پر سے گھوڑوں کے گذرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ بعض اس تکلیف سے سخت بیمار ہو جاتے ہیں اور بعض مر بھی جاتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ان اشخاص سے بہت مناسبت رکھتا ہے جو روز عاشورا زنجیروں اور تلواروں سے خود کو مجروح کر لیتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ ہم اس طریقہ سے "خامس آل عبا علیہ التحیۃ والثنا" کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام اسلامی قواعد کی رو سے سراسر ممنوع ہے۔ افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی بے علمی اور نادانی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اپنے وجود کو

جو قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے اور جس سے ہر طرح کی دینی اور دنیوی ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں، ناقص اور عیب دار بنا لیتے ہیں، اور اپنی بداعمالی سے دین اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ دوسری مذہب والے یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ کام اسلام کے اصل فرائض اور احکام میں داخل ہیں۔ اور اس بناء پر سخت اعتراض کرتے ہیں شریعت اسلامی کے مقدس احکام پر جو تمام شریعتوں سے بہتر اور پاکیزہ تر ہیں، یہاں تک کہ اسلام کو معاذ اللہ ایک جھوٹا مذہب ظاہر کر کے مسلمانوں کو نیم وحشی اور آدمیت سے عاری گنتے ہیں اور نہیں جانتے کہ

اسلام بذاتِ خود ندارد عیبے — ہر عیب کہ ہست از مسلمانی ماست

مصری بھی دوسرے لوگوں کی طرح جہل اور خرافات پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اور بعض اب بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً فال نکالنا، ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال دریافت کرنا، ان کے یہاں عام ہے خصوصاً فرقۂ نسوان میں ان باتوں کا اعتقاد زیادہ ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی عورت کا شوہر سفر کو گیا ہوا ہے اور وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ کس وقت واپس آئے گا۔ یا کوئی یہ دریافت کرتی ہے کہ اس کے بیٹے کی شادی مبارک ہوگی یا نہیں تو اس وقت وہ فال گیر کی جانب رجوع کرتی ہے اور اپنی مشکل کے حل کرنے کی خواہاں ہوتی ہے یا تو نجومی اور فال گیر ستارہ شناسی سے اس مشکل کو حل کرتے ہیں

یا ایک دوسری ترکیب سے کام نکالتے ہیں جو بہت رائج ہے۔ یعنی پانسہ پھینک کر فال لیتے ہیں۔ فال گیر چند پرانے چھوٹے سکوں، چند شیشے کے ٹکڑوں اور موتیوں کو ملا کر اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔ اور ان کی ترتیب سے فال نکالتا ہے۔ ہر سلیم العقل شخص جانتا ہے کہ یہ عمل نہ صرف بے فائدہ اور مضر ہے بلکہ ان باتوں کے باعث متمدن قومیں جو ان باتوں کو دیکھتی ہیں۔ تمام مسلمانوں کو طعن و ملامت کا نشانہ بناتی اور ان کے عقل و فہم کا اسی سے اندازہ لگا لیتی ہیں۔ ان کے پیشوا یا ہادی جب ان خراب باتوں کو رائج دیکھتے ہیں تو فوراً ان کے ہاتھ میں ایک اچھا خاصا حربہ آ جاتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ امور بھی ان کے مذہبی فرائض میں سے ہیں۔ اور بغیر کسی تامل اور تاخیر کے کہہ دیتے ہیں کہ یہ شریعت تمدن اور انسانیت کے منافی ہے اور اس کے پیرو علم و معرفت کے دشمن ظاہر ہے کہ جب دیگر اقوام کے لوگ ان رواجوں کو دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کے حالات کا معائنہ کرتے ہیں تو وہ ان سے اس طرح نفرت کرنے لگتے ہیں گویا (نعوذ باللہ) اسلام ایک وحشیانہ یا درمرتج مذہب ہے اور اس سے غافل ہیں کہ یہ مراسم اور عادات اصول اسلامی کے سراسر خلاف ہیں اور ان کے ماننے والے شریعت مقدس اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اگر خود ان کے عاملین سے دریافت کیا جائے کہ تم کس نیت سے ایسا کرتے ہو، تو یقیناً جواب سے عاجز ہوں گے سوائے نادانی اور جہالت کے کوئی معقول عذر نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ روح اسلام نہ صرف

ان باتوں سے ناآشنا ہو بلکہ قرآن شریف اور احادیث کے بموجب جاہلیت کے ان نشانات کو قائم رکھنا ممنوع اور منسوخ ہو یہ بات انھیں سمجھ لینی چاہئے کہ فال گیری ستارہ شناسی ۔قسمت کے حالات دریافت کرنا بلورسے فال لینا، افسوں وغیرہ وغیرہ سراسر صاحب شریعت کے نزدیک مذموم ہیں۔ اور ان کا ناجائز ہونا ہر شخص کو جو ذرا بھی عقل و تمیز رکھتا ہے۔ معلوم ہے۔ یہ مراسم اخلاق عامہ کو خراب کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے اعتماد نفس ۔مفید آلات و اسباب بنانا تحصیل علم و معرفت ۔تکمیل آداب انسانیت ۔ ادب وصنعت وحرفت کا رواج دینا یہ سب باتیں اٹھتی جاتی ہیں۔ اور وہ بری خصلتیں اور خراب عادتیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں جن کی بدولت مسلمان اس ذلیل حالت کو پہنچ گئے ۔یہ باتیں یہاں تک مضر ہیں کہ خدا کے احکام کو دوسروں کی نظروں سے چھپا دیتی ہیں۔ اور مسلمانوں کے دماغ کو ان دوراز کار خرافات وتوہمات سے مملو کر دیتی ہیں اور اس حالت میں خواہ مخواہ صداقت اور دیانت ،آدمیت و انسانیت ، فضیلت علم و معرفت کی قدر ان کی نظروں میں نہیں رہتی اور سوائے ان باطل اوہام پر توجہ کرنے کے کوئی کام سمجھ میں نہیں آتا ۔افسوس کہ ہم اپنے موضوع سے بہت دور نکل آئے ۔ ان بدبختیوں کو واضح کرنے کے لئے بڑی ضخیم کتابوں کی ضرورت ہو ۔افسوس ہو کہ یہ گزشتہ باتیں تمام مسلمانوں میں اس درجہ پختہ ہوگئی ہیں کہ جبتک باقاعدہ تربیت نہ ہو اور تمدن کی روشنی نہ پھیلے وہ زائل

نہ ہوں گی۔

مصر کے نواح ہی میں نہر سوئیز ہے جس کا ہم مختصر ذکر کرتے ہیں۔ پورٹ سعید اسکندریہ سے تقریباً ایک سو دس میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ اسی کی نہر سوئیز ہے جس کو سعید پاشا نے بنایا تھا، اور اسی کے نام کی نسبت سے اس کا یہ نام مشہور ہو گیا ہے۔ چونکہ دریائے احمر کا مخرج بحر روم سے ۹ میل دور ہے۔ اس لئے مصر کے ایک پرانے بادشاہ رامسس ثانی نے اس نہر کو ان دونوں کے بیچ میں کھدوایا۔ لیکن طغیانی کے زمانے میں وہ برابر ہو گئی۔ جب داراب اول بادشاہ ایران نے مصر پر قبضہ کر لیا تو اس نے دوبارہ ایک نہر بنوائی۔ تیسری مرتبہ عربوں نے مصر کو فتح کیا اور نہر کو بنوایا سنہ ۱۸۰۱ء میں نپولین بادشاہ فرانس نے ایک انجنیر کو مامور کیا کہ ایک بڑی نہر بنائے جس میں کشتیاں چل سکیں، لیکن اس انجنیر کو خیال گزرا کہ بحر احمر کی سطح بحر روم سے ۳۰ میل بلند ہے۔ لہذا اس نے اس خیال کو چھوڑ دیا۔ سنہ ۱۸۴۱ء سے سنہ ۱۸۴۹ء مطابق سنہ ۱۲۵۷ھ و سنہ ۱۲۶۵ھ میں اس شبہ کی تحقیق کی گئی اور لیسپس فرانسیسی انجنیر اس کام میں مشغول ہوا۔ اس نے سعید پاشا سلطان مصر سے ملاقات کی اور اپنا مجوزہ نقشہ اس کو دکھایا، اور اس کی مدد سے اس کام کو شروع کیا۔ شروع میں ۲۵ ہزار مزدوروں کو کام میں لگایا گیا۔ وہ لوگ مٹی کو ٹوکروں میں بھر بھر کر دوسری جگہ ڈالتے تھے۔ مگر بعد میں خاص قسم کی

کشتیوں سے کام لیا گیا جن میں نہایت زبردست مشینیں لگائی گئیں جو خاک کو وہاں سے ہٹاتی تھیں۔ اس کام میں بہت بڑے بڑے آدمیوں نے لسپس کی مخالفت کی لیکن یہ شخص ثابت قدم رہا۔ اور ہرگز اس بلند ارادے سے باز نہ آیا آخر کار تمام مخالفین پر غالب آگیا۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ۱۸۶۹ء میں اس نہر کا نہایت شان و شوکت سے افتتاح کیا گیا۔ فرانس کی ملکہ اور آسٹریا کا بادشاہ بھی رسم افتتاح میں شریک تھے۔ اس نہر کے مصارف ۲ کروڑ انگریزی پونڈ ہوتے ہیں۔ اس کا طول تقریباً سو میل تھا لیکن جب تجارت بڑھ گئی تو اس کی گہرائی اور چوڑائی بھی بڑھائی گئی۔ اب اس نہر کی ایک سو اٹھائیس فٹ گہرائی اور ایک سو چوالیس فٹ چوڑائی ہے۔ اس نہر کے تیار ہوتے ہی اس کے قرب و جوار میں بہت سی نئی عمارتیں بننے لگیں۔ مختلف اقوام کے لوگ مثلاً یونانی۔ مالٹی۔ اطالوی وغیرہ وہاں جمع ہوگئے۔ رفتہ رفتہ اس کے ساحل پر عالیشان عمارتیں بن گئیں۔ مصر کے عجائبات میں سے اہرام اور ابوالہول بھی ہیں۔ اہرام کی شکل نیچے مربع اور اوپر مخروطی ہوتی ہے ان میں بادشاہان قدیم کے مدفن ہیں۔ شاہ نوہ بڑے اہرام کی لمبائی ۷۴۶ فٹ اور چاروں جانب اس کی مساحت بارہ جریب اور اس کا ارتفاع ۴۵۱ قدم ہے۔ ایک عرب مصنف کا قول ہے کہ "اہرام کے پتھروں کو اس طرح رکھا گیا ہے کہ ایک سوئی یا بال بھی ان کے اندر داخل نہیں ہو سکتا" ان کو ایک قسم کے مصالح سے

جس کی موٹائی کاغذ کے برابر ہے جوڑا گیا ہے۔ اسفنکس یا ابوالہول کی ایک
خیالی شکل ہے۔ اس کا چہرہ آدمی کے مانند اور بدن اور پاؤں شیر کی طرح ہیں۔ یہ
اہرام اور اسفنکس سیاحوں کو حیرت میں ڈالتے ہیں اور پچھلے لوگوں کی یاد دلاتے
ہیں۔ علم آثار قدیمہ کے لحاظ سے ان کی بہت اہمیت ہے۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے
"مختلف زمانوں میں اسفنکس کی آنکھیں کھلی رہی ہیں۔ اس نے بغیر حرکت کے
دنیا کی فضا کو دیکھا ہے۔ اس نے مصر کے پرشوکت فرعونوں، یہودیوں کے شارعوں
ایران کے بادشاہوں اور یونان کے فلسفیوں، عیسائی زاہدوں، شجاعان
تازی اور دانشمندان فرنگ کو دیکھا ہے اور ان سب نے اس کی آنکھوں
کو دیکھا ہے جو ساکن اور بے حرکت ہیں لیکن معنی اور حقیقت سے پر ہیں۔ اب بہتر
ہے کہ ہم اس ذکر کو طول نہ دیں اور اپنے اصل مطلب پر آئیں۔

اکثر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ عیسائی ملکوں میں قاعدہ ہے کہ ایک مخصوص
جماعت کو مذہب عیسوی کو فروغ دینے کے لیے تیار کرتے ہیں اور مرد
عورتوں کے وفد تمام عالم میں جہاں دیگر مذاہب رائج ہیں، بھیجتے ہیں تاکہ
وہاں اپنے مذہب کی اشاعت کریں۔ یہ مبلغین مختلف شکلوں میں
ایسے علاقوں اور ملکوں میں جاتے ہیں جہاں اس سے پہلے کبھی انسانیت
کی بو بھی نہ پہنچی ہو اور لوگوں کو اپنے مذہب پر لانے کی کوششیں کرتے
ہیں بعض تو اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ہر قسم کی مشقت اور زحمت اٹھاتے

ہیں۔ مثلاً افریقہ میں شفاخانے بنا کر مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور اس طریقے سے
لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کو عیسائی کر لیتے ہیں ان میں سے
بعض لوگ کارخانہ اور مطبع جاری کرتے ہیں اور مدرسے بناتے ہیں اور بچوں
کو بغیر کسی اجرت یا فیس کے تعلیم دیتے ہیں اور اُن کی طبیعت کو اپنے خیالات اور
مقاصد کے موافق کر لیتے ہیں۔ یہ تمام مرد اور عورتیں اس مقصد کے حصول
میں کوشاں ہیں۔ انھوں نے ہزاروں لوگوں کو عیسائی بنا لیا ہو اور بنا رہے
ہیں۔ ان مشنریوں میں سے بہت سے لوگ اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے
ہیں اور محض اپنی خواہش سے اس جماعت میں شامل ہو کر طرح طرح کی زحمتیں
اور تنگیاں اٹھاتے ہیں۔ ہم جو حالات ذیل میں لکھ رہے ہیں وہ محض اس لئے
نہیں کہ ان کی کوششوں اور کارناموں کی تعریف و توصیف کریں بلکہ ہمارا
مطلب یہ ہو کہ دیگر اشخاص بھی ان باتوں سے عبرت حاصل کریں اور سمجھیں کہ
کیونکر اپنے دین اور وطن کی خدمات انجام دینی چاہئیں۔

مس لوئیس ویٹلی ڈبلن کے لاٹ پادری کی دوسری لڑکی تھی جو سنہ ۱۸۲۴ء
(مطابق سنہ ۱۲۴۰ھ) میں پیدا ہوئی۔ بچپن ہی سے نیک کاموں سے شوق اور
رغبت رکھتی تھی اور خصوصیت سے فقیروں اور غریبوں سے مہربانی اور شفقت
سے پیش آتی تھی۔ سنہ ۱۸۵۸ء مطابق سنہ ۱۲۷۵ھ میں اس نے قاہرہ اور فلسطین کا
سفر کیا اور ان ملکوں سے اسے بہت دلچسپی اور لگاؤ پیدا ہو گیا۔ سردی کے

موسم میں طبیبوں کی صلاح سے وہ مصر گئی تاکہ آب و ہوا تبدیل ہو اور صحت میں
جو خرابی پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہوجائے پہلے قصد تھا کہ فقط پانچ چھ ماہ مصر میں
گذارے لیکن بعد میں اسے وہاں کے باشندوں سے محبت ہوگئی اور اس
نے اپنی زندگی کے باقی برس انھیں کے درمیان گزارے۔ یہاں تک کہ
اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت کی۔ خاتون موصوفہ نے پہلے ایک
ایسے محلہ میں سکونت اختیار کی جو قاہرہ کا بدترین محلہ تھا۔ یہ وہاں گرد و نواح
میں چکر لگاتی تھی اور مسلمان عورتوں کے پاس جاکر اُن سے کہتی تھی کہ اپنے
بچوں کو تعلیم و تربیت دلانے کے لئے میرے پاس بھیجو اُن میں سے بعض نے
وعدہ کیا ہم تمھاری خواہش پوری کریں گے۔ دوسرے روز نو چھوٹی بچیاں
اس کے گھر جمع ہوگئیں اور نیم دائرے کی شکل میں زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کو
نوشت و خواند سکھانا نہایت مشکل کام تھا لیکن وہ ان کو پڑھانے کے علاوہ سینا
پرونا سکھاتی تھی۔ یہ سب لڑکیاں انگلستان کے بنے ہوئے انگشتانوں، سوئیوں
اور قینچیوں کی نہایت تعریف و توصیف کرتی تھیں اکثر اوقات ان کی مائیں
میوے اور بعض دیگر اشیا ان کے لئے لے کر آتی تھیں اور سمجھا کرتی
تھیں کہ بیچاری بچیاں بڑی آفت اور مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اگلے ہی دن
بچیوں کی تعداد بہا ہوگئی تھی۔ رفتہ رفتہ مس وٹیلی کے کام نے ترقی کرنی
شروع کی اور چھ مہینے کے اندر چھیالیس شاگرد اس جگہ جمع ہوگئے۔ اُن کو

پاکیزگی اور صفائی سکھانا بے حد دشوار تھا کیونکہ اُن کی ماؤں کا خیال تھا کہ بچے
اگر کثیف رہتے ہیں تو نظر بد سے محفوظ رہتے ہیں۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں اس نے
ایک بہت بڑا مکان خریدا اور ایک مدرسہ لڑکوں کے لئے بھی جاری کر دیا۔
اور شام سے بہت سے استاد بلوائے۔ اس مدرسے نے بتدریج ترقی کی،
یہاں تک کہ شاگردوں یا طالبعلموں کی تعداد چار سو ہو گئی۔ سنہ ۱۸۶۹ء (مطابق
سنہ ۱۲۸۶ھ) میں والی مصر نے ایک قطعۂ زمین مس وٹلی کو عطا کیا جہاں انہوں
نے ایک بڑی عمارت سکول کے بورڈنگ ہاؤس کی بنوائی اور دس سال بعد اس
نے ایک شفاخانہ قائم کیا اس کو اس قسم کے کام سے اس قدر شوق و ذوق تھا
کہ جب کبھی کوئی سخت جراحی کا عمل ہوتا تھا وہ خود وہاں جا کر مریض کی تسلی اور
دلداری کرتی تھی۔ ان کوششوں اور مساعی کے علاوہ جو اس نے قاہرہ
میں رفاہ عام کے لئے کی تھیں۔ وہ کسانوں کے دیہات میں جا کر (جو نیل کے
کنارے واقع ہیں) ان کا علاج اور تیمارداری کرتی۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں اس کو زکام
کی شکایت پیدا ہوئی اور اس معمولی شکایت سے اس نے وفات پائی۔ اس
خاتون کی کوششیں آخر کار بارآور ہوئیں۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں اس کی درخواست
کے بموجب انگلستان سے ایک جماعت مرد مشنریوں کی قاہرہ بھیجی گئی تاکہ دینِ
عیسوی کو اس جگہ پر رواج دیں۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک اور شفاخانہ بنایا گیا۔ اب
بھی ان کی قائم کی ہوئی بعض افادہ گاہیں مصر کے شہروں اور گاؤں میں

باقی ہیں، اس دوا علاج کے علاوہ ایک مطبع بھی جاری کیا اور کئی ہزار عربی کی کتابیں وغیرہ جمع کرکے لائبریری قائم کی۔ درحقیقت ان لوگوں نے اپنے وطن اور مذہب کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

اس مختصر بیان کو مایۂ عبرت اور تازیانۂ غیرت ہونا چاہیئے۔ جو لوگ غفلت اور سستی کو سعی اور کوشش پر ترجیح دیتے ہیں ان کو اپنی ہی عقل سے انصاف کرکے دیکھنا چاہیئے کہ اُن کی زندگی کا نتیجہ اور مقصد کیا ہے۔ تمام مسلمانوں کا دعوےٰ ہے کہ دین اسلام بہترین دین ہے لیکن انھوں نے اپنے دل کو محض ایک خشک اور خالی ولولے سے بے معنی باتوں سے مطمئن کر رکھا ہے اور یہی نہیں کہ انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں کوشش نہیں کی جو انسانیت کی روح ہے۔ بلکہ اس درجہ سست اور کاہل ہوگئے ہیں اور ان کے دماغوں میں جہالت اور خرافات اس درجہ سماگئی ہے کہ نزدیک ہے کہ جنون میں مبتلا ہوجائیں، اُن سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ عیسائی مشنریوں کی طرح تحمل کے ساتھ سختیاں اور مصائب اٹھائیں اور اپنی جانوں کو سخت خطروں میں ڈالیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ وہ اتنا ہی کریں کہ اس تاریکی اور جہالت کو دور کریں جس نے اُفق اسلام کو بالکل تیرہ و تاریک کر رکھا ہے اور علوم و فنون کو رواج دے کر اپنے بھائیوں کی آنکھیں کھولیں جو جہالت کی زیادتی کی وجہ سے بند ہیں اور ان کو زمانے کی رفتار اور

ضروریات سے واقف و آگاہ کریں آخری مطلب یہی ہو کہ اگر دوسروں
میں اسلام نہ پھیلائیں تو کم از کم اتنا کریں کہ مسلمانوں کو ہدایت کے راستے سے
منحرف ہو کر جہالت کے گڑھے میں نہ گرنے دیں۔

سخن سربستہ گفتم با حریفاں
خدایا زیں معما پردہ بردار

فلورنس نائٹ انگیل

اگر ہم دنیا کی ان تمام قابل فخر خواتین کا شمار کریں جنھوں نے اپنے ابنائے جنس کی خدمت کی، ان کو زحمتوں اور تکلیفوں سے بچایا اور ان کے لئے آرام و آسایش کا انتظام کیا تو ہمیں اس زمرے میں فلورنس نائٹ انگیل کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس عالی رتبہ خاتون نے نہایت ہی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور درحقیقت مریضوں کی حالت میں ایک تغیر عظیم کر دیا ہے۔ خاتونِ موصوفہ نے جب تک اس کام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ انگلستان بلکہ تمام یورپ میں تیمارداری کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔ غریب مریض شفاخانوں کے کونوں میں پڑے رہتے تھے اور ان کے ساتھ کوئی رعایت یا رفاقت نہ کی جاتی تھی۔ ہر ایک شخص نرسوں سے خوف کرتا اور وحشت کھاتا تھا۔ اور نرسیں عموماً بہت بے رحم ناداں اور بداخلاق ہوتی تھیں۔ اگر کوئی شاذ و نادر ان خراب باتوں سے بری بھی ہوتی تو وہ بدقسمتی سے خرافات و توہمات میں ضرور گرفتار رہتی تھی۔ ان نرسوں کی حالت اس درجہ خراب تھی کہ ایک مشہور انگریز مصنف نے اپنی ایک کتاب میں ان کی حالت کا نقشہ کھینچا

ہے اور نہایت فصاحت کے ساتھ ہجو ملیح کی ہے کہ "شراب کی بوتلیں بھری ہوئی قریب رکھی ہوئی ہیں، نشہ چڑھا ہوتا ہے اور کوئی توجہ مریضوں کی حالت پر نہیں کی جاتی" لیکن جوں ہی فلورنس نے اس کام میں قدم بڑھایا۔ وہ پرانی برائیاں یک قلم دور اور معدوم ہو گئیں۔ اور لوگوں کو جو وحشت اور نفرت نرسوں سے تھی وہ دور ہو گئی اور واقعاً ڈاکٹری کی تاریخ میں اور ہسپتالوں کے انتظام میں ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

زمانہ قدیم سے سب لوگ یہ کہتے آئے ہیں کہ تیمار داری عورتوں کا کام ہے لیکن عورتوں کی تعلیم نہ ہونے سے اور اس بیہودہ خیال کی وجہ سے کہ یہ ملازمت ان کے شایان شان نہیں ہے یہ کام صرف اُن عورتوں کے لئے مخصوص ہو گیا تھا جو اس کو کرنے پر مجبور تھیں یعنی وہ کوئی وسیلہ اور دولت نہیں رکھتی تھیں۔ اس لئے نہ ڈاکٹری حاصل کر سکتی تھیں اور نہ خود کو اس پیشے کے لائق ثابت کر سکتی تھیں۔ جو تعلیم فلورنس کی زندگی نے دوسروں کو دی وہ یہ ہے جس قدر تحصیل و تدریس اس کام میں مردوں کو کرنی چاہئے اسی قدر عورتوں کو بھی ضروری ہے۔ ممالک متمدنہ میں کوئی نوجوان طبابت، وکالت وغیرہ بلکہ باغبانی اور تجارتی تک اختیار نہیں کرتا جب تک کہ سالہا سال اس کی ضروری تعلیم حاصل نہ کرلے اور محنت کر کے خود کو اپنے پسند کئے ہوئے شغل کے قابل نہ بنائے لیکن پرانے زمانے میں اکثر لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان ہر

کام انجام دے سکتا ہے۔ خواہ وہ اس کی تعلیم حاصل کرے خواہ نہ کرے۔ تربیت
اور استعداد حاصل کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

مس فلورنس سنہ ۱۸۲۰ء (مطابق سنہ ۱۲۳۶ھ) میں اطالیہ کے خوبصورت شہر میں
جو فلورنس کہلاتا ہے پیدا ہو کر اس نام سے موسوم ہوئی تھی۔ یہ انگلستان کے
ایک دولتمند شخص کی بیٹی تھی۔ جب اس کا زمانۂ شباب آیا تو تمام راحت و آرام
کے سامان بلکہ عیش و مسرت کے لوازمات اس کے لئے موجود تھے۔ لیکن اس
نے ان تمام چیزوں کو نظر انداز کیا۔ اور خود کو اس کام کے لئے وقف کر دیا کہ کیونکر
اپنے وطن میں نرسنگ کو ایک باضابطہ پیشہ بنا دے۔ اور اس طریقے سے اپنے
ہمجنسوں کو فائدہ پہنچا دے۔ اپنی جوانی کے زمانے میں سوائے اپنے ابنائے
جنس کی ہمدردی اور خدمت کے کوئی کام نہ کرتی، اور مریضوں کی عیادت
غریبوں کی خدمت کے واسطے ہر وقت کمربستہ رہتی۔ یہاں تک کہ نزع کے وقت
بھی ان کی امید منقطع نہ کرتی۔ اگر اتفاقاً کسی کے ضرب آجاتی یا کوئی اور صدمہ
پہنچتا یا کوئی پتھر سے زخمی ہو جاتا تو سب سے پہلے اس کی خدمت کے لئے فلورنس
تیار ہوتی۔ اس چھوٹے شفاخانے کی افسری کا عہدہ لینے کے قبل دس سال
تک اس نے نرسنگ کی تعلیم حاصل کی اور اپنی تحصیل کو صرف وطن ہی تک
محدود نہیں رکھا بلکہ ایک سال تک کیسرورٹ میں جو جرمنی میں واقع ہے
ڈاکٹری کے مخصوص کالج میں تکمیل فن کی۔ جرمنی نے فن ڈاکٹری میں ایسی

ترقی کی تھی کہ دوسرے یورپ والوں کو اس کا بالکل علم بھی نہ تھا۔ اس کے بعد فرانس، اطالیہ وغیرہ ملکوں میں جا کر کالجوں میں اپنے فن میں اور استعداد حاصل کی اگر یہ دولتمند خاندان سے نہ ہوتی تو ہرگز اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی کہ اتنی مسافت طے کرے اور اس قدر خرچ برداشت کرے۔ لیکن یہی بات اس کی شرافت اور افتخار کو نمایاں کرتی ہے، کیونکہ غریب اور محتاج لوگوں کو خدمت نوع کرنے میں چنداں وقت حائل نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ایک متمول شخص دولت و حشمت سے منہ موڑ کر اپنے وجود کو نیک کاموں کے لئے وقف کر دے تو یقیناً وہ دو چند ایثار اور فداکاری کرتا ہے۔ اول تو وہ دولت و ثروت پر رنج و مشقت کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی میں عمر صرف کرتا ہے۔

دس سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ایک شفاخانے میں گئی جو لندن کے تمام شفاخانوں میں بہترین تھا۔ لیکن یہ شفاخانہ بھی بے انتظامی اور بے ترتیبی کی وجہ سے خراب حالت میں تھا۔ مس فلورنس نے جو دو مہینے وہاں گزارے۔ وہاں کے تمام مالی امور اور جملہ معاملات کی تنظیم و تنسیق کی اور اس کا نصب العین بہت بلند کر دیا۔ اس کی اخلاقی کوششوں کے یادگار کے طور پر اس شفاخانے کا نام اس سے منسوب ہے۔ اور وہ ہمیشہ ان مساعی کا مشکور رہے گا۔

۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا چھڑ گئی۔ یعنی فرانس اور انگلستان نے ٹرکی کی حمایت میں اور روس کی مخالفت میں قدم اٹھایا۔ لڑائی شروع ہونے کے چند ہی ہفتے بعد انگلستان میں خبر پہنچی کہ جس قدر خوراک وغیرہ میدان جنگ میں بھیجی گئی تھی خراب اور ضائع ہو گئی، اور بیماروں کے لئے جو ڈاکٹروں کا انتظام ہو وہ بہت ناقص ہے انتظامات میں غیر معمولی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ بڑے بڑے عقلمند انگریز سخت حیران و پریشان تھے۔ جو گوشت کہ ڈبوں میں بند کر کے فوج کے لئے بھیجا جاتا تھا وہ اس قدر خراب ہو جاتا کہ اس میں اور زہر میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا۔ جوتوں اور پوستین سے بھر کر جہاز بھیجے جاتے لیکن جب وہ وہاں پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ فقط بائیں پاؤں کے جوتے ہیں۔ تمام انتظام اسی طرح سے درہم برہم تھا۔ ایک انگریز مصنف اپنی کتاب موسومہ ”تاریخ زمانہ حاضر“ میں لکھتا ہے کہ ”طبابت اور ڈاکٹری کا کچھ سامان جو سقوطرہ کے مریضوں کے لئے بھیجا جاتا تھا وہ لازماً وارنا میں ضائع ہو جاتا تھا۔ یا ان جہازوں میں جو خلیج بالکالاوا میں پہنچتے وہاں ضائع اور خراب ہو جاتا۔ اگرچہ ہیلتھ آفیسر عقلمند اور کارکن لوگ تھے اور حکومت انگلستان بھی ان کو تمام آلات اور سامان بھیجتی تھی لیکن وہ سامان ڈاکٹروں کے پاس نہ پہنچتا تھا اور وہ بیچارے معطل اور بیکار رہتے اور کوئی کام نہ کر سکتے تھے اور ان بیچارے مریضوں کی مصیبت اور تکلیف دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے جو بغیر علاج اور معالجے کے پڑے رہتے تھے لیکن

ان کی مدد کرنے سے معذور تھے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ہزار آدمیوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ ان کی موت کا سبب یہ جنگ نہ تھی بلکہ اس کی ذمہ داری حفظان صحت کا سامان نہ ہونے پر، پھل، ترکاری اور چائے نہ ملنے پر اور شفاخانوں پر ہے۔ اس زمانے کا ایک مورخ اس تعداد کو جو جنگ کریمیا کے زمانے میں تلف ہوئی اس طرح بیان کرتا ہے کہ "بیس ہزار چھ سو اٹھاون آدمیوں میں سے جو ضائع ہوئے صرف دو ہزار پانسو نوے ایسے تھے جو میدان میں کام آئے اور اور اٹھارہ ہزار اٹھاون آدمی ہسپتالوں میں مرے۔ اس قدر تعداد ضائع ہوئی کہ ایک فوج کے صرف سات آدمی باقی رہ گئے۔ اور دوسری فوج کے تین آدمی! جس وقت مریضوں کو شفاخانے لیجانے کے لئے جہازوں میں روانہ کرتے تھے تو ان میں سے اس قدر ضائع ہو جاتے تھے جن کے خیال سے بھی وحشت ہوتی تھی۔ بعض جہازوں میں ۴۲ فیصدی سے زیادہ لوگ زندہ نہیں بچے حالانکہ جہاز کی مسافت صرف سات روز کی تھی بعض شفاخانوں میں اگر علاج کوشش سے کیا بھی جاتا تھا تو چار چار پانچ پانچ آدمیوں پر ایک ساتھ عمل جراحی کیا جاتا تھا جس سے بعض لوگ مرض ناسور میں مبتلا ہو کر مر جاتے تھے۔ اول چار ماہ جب اکار کا محاصرہ تھا اس قدر جانیں تلف ہوئیں کہ اگر یہی حالت قائم رہتی تو ایک سال سے بھی کم زمانے میں تقریباً آدھا لشکر ختم ہو جاتا۔ اس وقت انگلستان میں یہ خبریں شائع ہوئیں لوگوں میں نہایت گھبراہٹ اور

شرمندگی پھیل گئی۔ وزیر جنگ نے اس وقت مس فلورنس نائٹ انگیل کے پاس
جاکر خواہش ظاہر کی کہ وہ باقاعدہ تربیت و تعلیم یافتہ نرسوں کی جماعت کو اپنے
ساتھ لے کر مریضوں کی خدمت کے لئے میدان جنگ میں جائے۔ اس نے
فوراً ان کی یہ استدعا قبول کر لی اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی پیش قدمی
میں مداخلت کرے یا حارج ہو کر دیر کرے اس نے تاکیدی احکام وزیر جنگ
سے لے لئے اور ۲۱ر اکتوبر ۱۸۵۴ء کو نائٹ انگیل کل بیالیس تربیت یافتہ نرسوں
کو ساتھ لے کر روانہ ہوئی اور ۴ر نومبر کو وارد اسطامبول ہوئی۔

اس زمانے میں جب دونوں فوجوں میں جنگ عظیم برپا تھی مس نائٹ
انگیل نے پہلا کام یہ کیا کہ علاوہ ان دو ہزار تین سو مریضوں کے جو شفاخانوں
میں تھے لڑائی کے زخمیوں پر بھی توجہ شروع کی اور اس نے اپنی نرسوں
کی جماعت کے ہمراہ اس فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ثابت
قدمی اور مہربانی کے ساتھ اس نے ان تمام برائیوں اور خرابیوں کو دور کیا جو
اس وقت رائج تھیں اور اس کے بجائے تنظیم و تربیت تمام شفاخانہ میں
قائم کی۔ خاتون مذکورہ نے اتنی مافوق العادت زحمتیں برداشت کیں۔
جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو چوبیس چوبیس
گھنٹے اس کو مصروف رہنا پڑتا اور بیماروں کو راحت اور آرام بہم پہنچانا پڑتا
تھا۔ ان کی آسائش اور راحت کے لئے ہر طرح کا سامان فراہم کرنے کی

حتی الوسع کوشش کرتی، صرف یہی نہیں بلکہ جن باتوں نے لشکر اور شفا خانے کو اس درجہ خراب حالت میں پہنچا دیا تھا ان کو رفع کرتی۔ اس کی خدمت کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے آنے سے چند ماہ بعد ہی دس ہزار مریض اس کے زیر نگرانی تھے، اور صرف ایک شفا خانے میں بستروں کی صفیں اڑھائی میل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر بستر میں صرف ۲ فیٹ ۶ انچ کا فاصلہ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کے دل میں اس کی ذات کا رعب اور اثر بہت زیادہ تھا۔ سب اس کا کہنا مانتے تھے سب کو معلوم تھا کہ اس خاتون نے راحت و ثروت کو چھوڑ کر محض ان کی آسائش کے لئے اتنی زحمتوں اور تکلیفوں کو برداشت کیا ہے۔ اس کا ہنس مکھ اور دُبلا چہرہ۔ اعضا کی چستی چالاکی، اس کی دل پسند اور عمدہ عادتیں اور محبت ان چیزوں نے ان سب کے دلوں پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ تمام علاج اور تیمارداری اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے بعض اوقات سپاہی آپریشن کرانے سے انکار کرتے تھے، کیونکہ اس میں بہت تکلیف اور درد ہوتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ نہایت ضروری اور لازمی بھی ہوتا تھا۔ اس وقت مس نائٹ انگیل ان کو تسلی دینے کے لئے ایسی باتیں کرتی تھی کہ وہ بالکل مطمئن اور راضی ہو جاتے تھے۔ ایک سپاہی بیان کرتا ہے کہ مس موصوفہ کے آنے سے قبل تمام سپاہی تکلیف اور درد کی سختی کی وجہ سے ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے اور گالی گفتار کرتے رہتے تھے اور برے الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن

اس کے آنے کے بعد ایسی کایا پلٹ ہوئی گویا شفاخانہ ایک کلیسا تھا جہاں کوئی خلاف تہذیب کلمہ منہ سے نہ نکال سکتا تھا اور دوسرا سپاہی کہتا ہو "مس فلورنس کبھی کسی کی خبر لیتی کبھی کسی کے پاس بیٹھتی لیکن چونکہ ہزارہا مریض بھرے ہوئے تھے اس لیئے ہر ایک کے پاس دیر تک نہ بیٹھ سکتی تھی۔ مگر ہم اسی میں خوش تھے کہ اس کا سایہ جو ہمارے بستر پر پڑجاتا ہے۔ اسی کو چوم لیں اور پھر اس کے بعد نہایت مسرور اور مطمئن ہوکر آرام سے لیٹ جاتے۔

۱۸۵۵ء میں یہ ایک بخار میں مبتلا ہوئی جسے ہسپتال کا بخار کہتے ہیں لیکن تھوڑا افاقہ ہوتے پھر اس نے محنت سے کام شروع کردیا اور اس وقت تک اس کام سے منہ نہ موڑا جبتک جنگ ختم نہ ہوگئی اور سپاہیوں کی آخری جماعت انگلستان کو روانہ ہوگئی جب یہ انگلستان واپس پہنچی تو اس کا اس قدر عظیم الشان استقبال کیا گیا کہ کسی شاہی خاندان کی خاتون کا بھی نہ کیا گیا ہوگا۔ تمام گروہ اور فرقے اپنے اختلافات کو یک طرف کرکے اس کی تعظیم و تکریم میں یک دلی سے شامل ہوئے۔ علیا حضرت ملکۂ وکٹوریہ نے اس کو جنگ کریمیا میں خدمات انجام دینے کی یادگار میں ایک جڑاؤ گلوبند تحفہ دیا۔ سلطان ترکی نے بھی الماس کے قیمتی دست بند مرحمت فرمائے۔ تمام یورپین اقوام نے اس کی خوبیوں کی تعریفوں میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ اور تیس ہزار پاؤنڈ چندہ کرکے اس رقم کو اس کی حسب خواہش نرسوں کا کالج قائم کرنے میں صرف کیا۔

جنگ کریمیا کے زمانے سے آجتک یورپ میں کوئی ایسی لڑائی نہیں ہوئی جہاں نرسوں کی تربیت یافتہ جماعت کو تیمارداری کے لئے نہ بھیجا گیا ہو۔ مس نائٹ انگیل کے ان کارناموں کی بدولت دس سال بعد یورپ کی حکومتوں نے جنیوا میں مجلس بین الاقوامی قائم کی۔ اور مریضوں اور مجروحین کے آرام کے لئے چند قواعد اور قوانین مقرر کئے اور ان قواعد کے مطابق ڈاکٹری کے تمام آلات اور باقاعدہ ہسپتالوں کو جنگ سے اور اس میں رہنے والوں کو لڑنے والوں سے علیحدہ سمجھا گیا۔ اب تمام دنیا میں سب کو یہ معلوم ہے کہ صلیب احمر ہی جو جنیوا میں مقرر ہوئی ایک ایسا متمدن عنصر ہے جو جنگ کی حیوانیت اور وحشت کو کم کرتا ہے۔ اس جنگ سے اس کی موت تک جو زمانہ گذرا اس میں کئی سال تک اس کا دماغ مختل رہا۔ لیکن بہت کم امکان ہے کہ اس کی طرح کوئی ایسے قابل قدر کارنامے دکھا سکے۔ موصوفہ نے ہندوستان کی صحتی حالت کے متعلق بعض ہدایات یہاں کی حکومت کو بھی دی تھیں۔ جنگ کریمیا کے تجربوں سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ علاج اور تیمارداری کا کام خوش اسلوبی اور درستی سے کیا جائے تو اموات کی تعداد آدھی رہ جائے اور اس کے بارے میں اس نے بہت مفید تجاویز حکومت انگلستان کے سامنے پیش کیں۔ اس کی تجاویز نے نہ صرف جنگ کے انتظامات صحت میں اصلاحات کیں بلکہ بعض مقامات میں مثلاً ہندوستان میں بھی مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ چند کتابیں اس فن کے متعلق چھپ

ہیں اس نے مہارت حاصل کی تھی، تصنیف کیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مضمون میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ کوئی گھران کتابوں سے خالی نہ ہونا چاہیئے۔

اس کے علاوہ جہاں کہیں اصلاحات خانہ داری کی کوشش ہوتی موصوفہ خدمت نوع سے دریغ نہ کرتی۔ سب سے پہلی اور اہم ترین چیز جو اس نے مریضوں کے لئے لازم قرار دی وہ صاف اور تازہ ہوا ہے اس کے بعد صفائی اور پاکیزگی کو ضروری بتایا ہے۔ اور خواب و خوراک کے بارے میں مفید مشورے دئے ہیں۔ لاکھوں آدمی جنھوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا اس کی باتوں سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

ایک خط کے ضمن میں جو اس نے کسی خاتون کو لکھا تھا جو اس سے مخصوص نصیحتوں کی طالب تھی وہ لکھتی ہے "میری پہلی وصیت ان عورتوں کو جو اس کام کو اختیار کریں یہ ہے ان کو چاہیئے کہ مثل مردوں کے تعلیم حاصل کریں اور یہ گمان نہ کریں کہ ہم بغیر تعلیم کے بھی اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ کوئی شخص یونانی زبان کی تعلیم نہیں دے سکتا جب تک کہ اس میں مہارت تامہ نہ حاصل کرے۔ اسی طرح یہ کام بھی انسان بغیر تعلیم نہیں جان سکتا بلکہ تحصیل و مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ دوسرے اگر مردوں کے سے کام کرنا چاہیں تو یہ خیال نہ کریں کہ اس وجہ سے کہ وہ عورتیں ہیں ان کو خاص رعایات اور

دوسروں سے امتیاز حاصل ہونا چاہئے۔ کام کرنے کے طریقے سیکھنے لازم ہیں جس طرح مرد سیکھتے ہیں۔ اس وقت خدا بھی ان کے کاموں میں مدد دیتا ہے کیونکہ اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اپنے کام اور فرائض کو بے پروائی کے ساتھ نامکمل طور پر انجام دیں گے۔

اسی طرح اس خاتون مرد صفت نے اپنا تمام وقت خدمت نوع میں صرف کیا۔ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی اس مفید مذہبی کام سے غفلت میں صرف نہ کرتی جو اس کا شعار تھا۔ اس کی وفات سے دو سال قبل انگلستان کے تمام اخبار و اور رسالوں نے بڑے بڑے آرٹیکل اس کی تعریف و توصیف میں لکھے تھے۔ اور اس کے نفع بخش کارناموں کی توضیح و تشریح کی تھی۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اگنس جونس

گزشتہ صفحات میں ہم نے دو ایسی ہمدرد نوع خواتین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مریضوں کی تیمارداری کو اپنا پیشہ بنایا اور انسانی فرائض کو پورا کیا۔ چونکہ یہ پیشہ عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور کئی خواتین نے اس ضمن میں کارہائے نمایاں انجام دئے اور اپنا نیک نام صفحۂ روزگار پر ہمیشہ کے لئے چھوڑا ہے۔ اس لئے چنداں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ایک اور خاتون کا حال بھی اس جگہ درج کریں۔ جو شخص ذرا بھی غور و فکر سے کام لے بخوبی جان سکتا ہے کہ اس کام میں کس قدر زحمتیں اور خطرات ہیں جن عورتوں نے اس قابل قدر کام کو اختیار کیا اور خدمت نوع انجام دی، نہایت تعریف و توصیف کی مستحق ہیں اور مناسب یہ ہے کہ تمام ملکوں کے مردان خواتین کے حال سے عبرت حاصل کریں اور اپنی زندگی کو جو ہر طرح ترقی کر سکتی ہے اور ہر قسم کی عمدہ صلاحیتیں رکھتی ہے بیکاری اور سستی میں برباد نہ کریں اور ایسے کام کریں کہ ہرگز عورتوں سے کم تر نہ رہیں۔ اگر متمدن قوموں کی عورتیں جن میں اپنی ہم جنسوں کو فائدہ پہنچانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور جن

کے اعمال ایسی نیک اور عمدہ ہیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ قوم کی بہی خواہی اور فداکاری میں اتنی سرگرمی دکھاتی ہیں تو اُن قوموں کی بارے میں کیا کہنا چاہیئے جن میں ایسے نفوس صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں یا بالکل ہی معدوم ہیں۔

گنس جونس تاریخ ۱۰ ر نومبر ۱۸۲۲ء انگلستان کے شہر کیمبرج میں متولد ہوئی۔ اس کا باپ کرنل جونس انگلستان کے فوجی افسروں میں سے تھا جب گنس جونس پانچ سال کی ہوئی تو وہ فوج جس میں اس کا والد تھا موریس میں بھیجدی گئی جو بحراوقیانوس ہند میں ایک جزیرہ ہے۔ جبتک اس کی بارہ سال کی عمر ہوئی وہ وہیں مقیم رہا۔ وہ آفتیں اور صدمے جو عیسائیوں کو مدغاسکر میں پہنچتے تھے ان سے متاثر ہوکر گنس خواہشمند ہوئی کہ اپنی عمر وعظ و تبلیغ میں بسر کرے۔ جب اس کے والدین موریس سے انگلستان واپس ہوئے تو وہ چار سال تک آئرلینڈ میں مقیم رہے۔ موصوفہ نے یہاں اپنے وقت کا زیادہ حصہ دریاؤں کے صاف ستھرے ساحل، خوشنما کھیتوں میں گزارا۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو اس کو انگلستان کے ایک کالج میں داخل کردیا گیا۔ وہ اپنے والد کے انتقال تک جو ۱۸۵۰ء میں ہوا وہیں تعلیم پاتی رہی۔ اگرچہ تحصیل علم میں اس نے بہت جلد ترقی نہیں کی لیکن توجہ اور محنت کے ذریعے اس نے اس کمی کو پورا کیا۔ اس کے والد کے انتقال کے بعد اس کی والدہ محض اس لئے کہ بچوں کی تعلیم مکمل کریں ڈبلین میں آئیں۔ ایک دفعہ گنس جونس ایک وعظ

کی مجلس میں حاضر ہوئی جو ایک بزرگ شخص نے کی تھی۔ اور وعظ و نصیحت سے بہت استفادہ حاصل کیا۔ اپنے مذہب میں اور بھی زیادہ راسخ اور ثابت قدم ہوگئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک مدرسہ کی معلمہ مقرر ہوگئی جو فقط غریبوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ وہ غریب اور بیکس طالبعلموں پر کمال توجہ اور محنت کرتی تھی۔ ان کی ذہنی اور مذہبی تربیت کے ساتھ ان کی جسمانی تربیت سے بھی غافل نہ رہتی تھی ان کو ورزش اور کسرت میں مشغول رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ تعطیل کے دن بھی یہ غریب اور ضعیف بچوں کے پاس رہ کر ان کی اعانت اور دست گیری میں مصروف رہتی۔ لیکن اس نے جو پہلا قدم اپنے اہم کام کے لئے اٹھایا وہ ۱۸۵۳ء میں فرانس کا سفر تھا۔ وہاں یہ ایک جلسہ میں شریک ہوئی جو کیسر ورت کے مذہبی لوگوں کے جلسہ کی ایک شاخ تھی۔ تربیت کے اصولوں سے جو واقفیت اسے وہاں حاصل ہوئی اس سے وہ بہت متاثر ہوئی اس کے دو ماہ بعد کیسر ورت کا سفر کیا اور اس کی بابت اس کا حسن ظن اور بھی بڑھ گیا۔ وہ کہتی ہے کہ "جب میں جہاز میں سوار ہوئی تو دل کو یقین نہ آتا تھا کہ وہاں جا رہی ہوں۔" اس کے بعد دوبارہ وہاں کا سفر کیا اور ایک ہفتے تک قیام کیا تاکہ ان لوگوں کے طرز عمل اور کاروبار سے کماحقہ آگاہی اور دلچسپی پیدا ہو جائے۔ کیسر ورت کے تمام انتظامات اور طریقہ کار اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے جو وہاں عام تھی یہ بہت محظوظ ہوئی۔ اور خواہشمند تھی کہ اس کام کے لئے تعلیم و تدریس شروع

کردے۔ کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ جو کام بھی انسان کرے اس کے لئے تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔

۱۸۵۶ء میں یہ اپنی والدہ سمیت ڈبلین سے اپنے اصلی وطن واپس آگئی کیونکہ وطن کی محبت نے اسے نہایت مجبور کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے والد بھی وہیں مدفون تھے۔ اس وجہ سے ان ماں بیٹوں کے نزدیک یہ جگہ بہت قابل تعظیم اور معزز تھی۔ اس مقام پر آکر اس نے بہت زور شور اور سرگرمی سے مریضوں کی خدمت اور ضعیفوں کی خبر گیری شروع کر دی۔ اس کی بہن لکھتی ہے کہ "مدرسہ میں بیماری کے دنوں میں جب غریبوں کے گھر کوئی حادثہ ہو جاتا یا کوئی مصیبت نازل ہوتی تو اسکی ذات بیحد تسکین بخش اور تسلی وہ ثابت ہوتی تھی وہ تمام گھرانوں میں سب کے پاس پہنچ کر محض قربۃً الی اللہ، خدا کی رضا کے لئے لوگوں کی دست گیری کرتی تھی۔ جس کسی نے ایک مرتبہ اسے دیکھ لیا تھا ممکن نہیں تھا کہ اس کو فراموش کرے جس وقت وہ کسی لمبے سفر سے واپس آتی تھی تو دھوپ اور جنگل کی ہوا سے اس کے چہرے کا رنگ ارغوانی ہو جاتا اور بال پریشان ہوتے مگر اس کے بشرے سے خوشی ٹپکتی تھی کیونکہ اس کی یہ زحمت اور مشقت فقیروں اور غریبوں کی بہبودی اور مسرت کا باعث ہوتی تھی۔ اس نے مریضوں کے لئے دوا تجویز کرنے زخموں کی مرہم پٹی کرنے اور خاص کر جلے ہوئے کی دوا کرنے میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ کسانوں

کے بچے اکثر آگ سے جل جاتے تھے۔ وہ مریضوں کی عیادت سے کبھی ہاتھ نہ اٹھاتی تھی جبتک انھیں صحت کامل نہ ہوجائے۔ اکثر اوقات ان کے لئے میوہ اور مٹھائی لے کرجاتی اور اس کام سے کبھی غفلت نہ کرتی۔ ان کو روز تھوڑی دیر تک انجیل پڑھ کر سنانا اس کا معمول تھا۔ جو جگہ بچوں اور جاہل آدمیوں کی سمجھ کے لائق ہوتی اس جگہ سے ترجمہ اور تفسیر کرکے سناتی۔"

سات سال تمام یورپ کی مسافرت کرنے کے بعد ارادہ ہوا کہ دوبارہ کیسر ورت کو دیکھے اور وہاں چند ہفتے گزارے۔ لیکن اس "جماعت پرہیزگاران" کی افسر نے اسے دیر تک ٹھرنے کے لئے اتنے کام اور فائدے بتائے کہ اس نے تمام سردی وہیں ٹھرنے کا قصد کرلیا۔ اس جماعت کے لوگ امور خانہ داری اور تیمارداری کی تعلیم پاتے تھے۔ کیونکہ رئیس جماعت کا خیال تھا کہ جب کسی کی علاج اور عیادت کو جائیں تو اس کے خانگی امور بھی انجام دے سکیں ان لوگوں کی باتیں مؤثر ہوتی تھیں اور چونکہ مذہبی ارکان ادا کرتے اور انجیل کو نہایت خوش الحانی سے تلاوت کرتے اور ہر روز دو تین گھنٹے خدا کی عبادت میں گزارتے تھے، اس وجہ سے ان میں مذہبی احساس بہت تھا۔ اگرچہ انھیں خانگی کام جھاڑو دینا، کمروں کی درستی، برتن دھونا وغیرہ کرنے پڑتے، لیکن پھر بھی اس راستے پر نہایت خوشی سے چلتے تھے اور یہ کہتے تھے اگرچہ دن لمبے ہوتے ہیں لیکن کام کی کثرت اور خوشی اور فرحت کی وجہ سے آدھے بھی معلوم نہیں

ہوتے۔ اس کے کیسر ورت آنے کے چند روز بعد چودہ لڑکے اس کے زیر نگرانی رکھے گئے۔ دن کے بارہ گھنٹے ان کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اور یہ کام چنداں آسان نہیں تھا۔ چونکہ ہر وقت ان کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ان میں سے بعض نے صحت پائی - اور اپنے اپنے کام میں مشغول ہونے کے قابل ہوئے۔ لیکن ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ اس کا کام بدل دیا گیا۔ اور وہ کام چند مہینے کے بعد مریض خانۂ اطفال کے ناظم کو سونپ دیا گیا۔ وہ نہایت افسوس اور مایوسی سے اس کام کو ترک کرنے ہی کو تھی کہ اس نے معلوم کیا کہ چند مریض لڑکوں کی حالت ترقی پذیر ہے۔ ایک خط کے ضمن میں جو اس نے اپنی کسی عزیز کو لکھا تھا، کہتی ہے کہ "مجھکو ان بچوں سے روز بروز مادرانہ محبت ہوتی جاتی ہے اور اب ان کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی ہے۔"

ایک روز کیسر ورت میں خبر پہنچی کہ شام کا انگریزی اسپتال نہایت خراب حالت میں ہے اور مریضوں کو ایک نہایت گندی اور کثیف جگہ میں رکھا گیا ہے۔ اگنس جونس کا ارادہ وہاں جانے کا ہوا اور وہ اپنی والدہ سے اجازت خواہ ہوئی۔ لیکن اس جماعت کی افسر نے رائے دی کہ انگلستان جانا چاہئے اور اس جگہ ایک خاتون سے ملاقات کی جو مشنری جماعت کی افسر تھی۔ اس کو کہا گیا کہ تم زنانہ مشنریوں کی ناظم ہونا منظور کر لو۔ وہ فوراً ہی نہایت سرگرمی سے اس کام میں مشغول ہو گئی۔ ماؤں اور بچوں کی مجلسوں

مذہبی مدرسوں اور طعام خانوں اور سونے کے کمروں کی دیکھ بھال، تمام مشنریوں کی پذیرائی میں مصروف ہو کر ہر شعبے میں نہایت جد و جہد سے اصلاحات کیں۔ اور مردانہ وار ہمت سے کام لیا۔ لیکن اس کے یہ مفید کام ایک دم بند ہو گئے کیونکہ اس کے پاس ایک تار پہنچا کہ تمھاری بہن روم میں سخت بخار میں مبتلا ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرا تار ملا جس میں اس سے جلد آنے کی خواہش کی گئی تھی۔ اپنا کام جلد جلد ختم کرنے کے بعد یہ روم روانہ ہو گئی وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ اس کی بہن تو خطرے سے بچ گئی ہے لیکن اس کے چچا کا لڑکا جو اسی کی جماعت کا ایک ممبر تھا اسی بخار میں مبتلا ہو گیا اور اس کا وہاں رہنا لازمی ہے۔ چونکہ ان دونوں کا مرض علاج پذیر تھا۔ اس لئے موصوفہ نے اپنا لندن جانا منسوخ کر دیا۔ اور ان کی حالت پر توجہ کی اور روم میں چند مہینے بسر کئے۔ جب ان دونوں کی حالت قدرے درست ہوئی تو چند روز کے لئے سوئٹزرلینڈ جا کر وہاں کی مشنری جماعتوں کا معائنہ کیا۔

جس وقت کہ اس نے اپنی والدہ اور بہن سے پیرس میں ملاقات کی تو پہلا کلمہ ان سے یہ کہا کہ مجھکو اجازت دیجئے کہ اپنی تمام عمر مریضوں کی تیمارداری میں صرف کر دوں۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام اس پر سب سے زیادہ فرض ہے۔ اسی اثنا میں اس سے استدعا کی گئی کہ غریب نرسوں کے ایک مدرسہ کی جو لورپول میں تھا منتظمہ بن جائے۔ لیکن اگنس جونس اس قسم کے

آدمیوں میں سے نہ تھی جو بغیر ضروری علم حاصل کئے ہر کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ اور اپنی ذات کو ہر قسم کے کام کے لئے مکمل سمجھتے ہیں۔ اور بغیر مہارت کے اس کو کرنے لگتے ہیں۔ وہ جانتی تھی جب حکیم اور ڈاکٹروں کو تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے تو نرسیں بھی تعلیم کی محتاج ہیں۔ یہ خیال کرکے اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ سینٹ طامس کے ہسپتال واقع لندن میں جائے اور اپنی تعلیم مکمل کرے۔ بالآخر سینٹ طامس کے کالج میں داخل ہوکر اس نے چاہا کہ مریضوں کا کام بھی کرے اور نرسنگ کی تعلیم بھی حاصل کرتی رہے چنانچہ چند روز بعد اس کو اس بات کی اجازت مل گئی۔ تھوڑے عرصہ بعد اس نے ایک مدرسہ چھوٹے پیمانے پر انجیل کی تعلیم دینے کے لئے کھول دیا جو بہت مفید اور عمدہ ثابت ہوا۔ اس کی مہربانی اور خاکساری کی وجہ سے تمام مریض اس کے معترف ہوگئے۔ اور اس کی طرف سے بہت حسن ظن رکھنے لگے۔ اگنس جونس کام کی زیادتی سے بہت خوش اور شادماں رہتی تھی اور کہتی کہ "میں اپنے کام سے حد درجہ خوش ہوں اور اس کو عزیز رکھتی ہوں"۔ یہاں ایک سال علم حاصل کرنے کے بعد ایک چھوٹے ہسپتال میں کام شروع کردیا۔ تھوڑے عرصہ بعد شمال کے ایک بڑے ہسپتال میں منتقل ہوگئی لیکن یہ کام اس کے حوصلہ اور طاقت سے بڑھ کر تھا۔ اس لئے اپنے دوستوں کی رائے سے اس نے گرمی کا موسم اپنے خاندان کے ہمراہ آئرلینڈ میں گزارا۔ اور اپنے فرائض کو

انجام دینے کی غرض سے وہیں سے ہسپتال کی ہر ممکن خدمت انجام دیتی رہی
اور اوائل سال ۱۸۶۵ء میں اپنے وطن سے روانہ ہو گئی ۔ انگلستان میں اکثر
جگہ بعض کارخانے ہیں جہاں صحیح البدن فقیروں کے لئے مختلف مشاغل مہیا
کئے جاتے ہیں اور جو فقیر کام نہیں کر سکتے معذور ہوتے ہیں ان کو بھی معاش
دیجاتی ہے ۔ چند ہسپتال بھی کارخانوں کے قریب ہیں ۔ ان کا انتظام یہ ہوتا
تھا کہ ان کارخانوں کے رہنے والے (جو اکثر بے تربیت اور اخلاق میں پست
ہوتے ہیں) مریضوں کی خدمت پر مامور ہوتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے
انتظام سے چنداں فائدہ نہیں ہو سکتا ۔ ایک سوداگر نے تحریک کی کہ بجائے
ان بے علم تیمارداروں کے بہتر ہوگا کہ تربیت یافتہ نرسیں اس کام پر مامور
کی جائیں اور اس نے خود تین سال تک وہاں کے مصارف برداشت کئے
تاکہ تین سال کے تجربہ کے بعد سب لوگ اس طریقے کی خوبیوں اور پچھلے انتظام کی
برائیوں سے آگاہ ہو جائیں ۔ اور اسی ترتیب سے کام چلتا رہے ۔ اگنس جونس
ان نرسوں کی سردار منتخب ہوئی ۔ یہ کام جو اس نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا بہت
مشکل تھا ۔ تقریباً ۵۰ نرسیں اور ڈیڑھ ہزار مریض اس کی زیر نگرانی تھے ۔ وہ
ہر روز علی الصباح اُٹھ کر اپنا کام شروع کرتی اور غروب آفتاب سے پانچ
گھنٹے بعد تک اس میں مشغول رہتی ۔ کبھی خوراک کے انتظام میں کبھی نرسوں
کے کام دیکھنے میں اور کبھی مریضوں کی دیکھ بھال میں ۔ ان مختلف کاموں

کے ہجوم سے ہرگز نہ گھبراتی تھی اور اپنی تمام کوشش لوگوں کو راحت پہنچانے میں
صرف کرتی تھی۔ مریضوں نے بھی بہت جلد اس جدید انتظام کی خوبیوں کو سمجھ لیا
انھوں نے دیکھا کہ بجائے پہلی سی سختی اور غفلت کے نرسیں ان سے نہایت محبت
اور شفقت سے پیش آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے پڑھنے کے لائق مفید کتابیں ان
کے کمروں میں رکھدی گئیں اور ان کی تفریح طبع کے لئے رنگا رنگ کے پھولوں
کے گلدستے رکھ کر کمروں کو معطر بنایا گیا۔ اور ان کو دوستوں سے ملاقات
کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگنس جونس ہر لمحہ اس خیال
میں رہتی تھی کہ ہر انتظام ایسا ہو جس سے مریضوں کو آرام اور تفریح حاصل ہو۔
دو سال کے بعد اس نے انجیل کی تعلیم دینی شروع کی۔ پہلے دن ۲۰ آدمی اس
کے درس میں شریک ہوئے اور اتوار تک سو سے زیادہ آدمی ہو گئے آئیے
ذرا ہم اس کو اپنے تخیل میں دیکھیں کہ کیونکر بیماروں اور کمزوروں کے حال
پر توجہ کرتی ہے۔ اس کے وقار اور بردباری کی وجہ سے جو ہمیشہ سے اس کا شعار
تھا۔ تمام بیمار اور یہاں تک کہ نہایت بدمزاج اور درشت ترین لوگ بھی اس کی
اطاعت کرتے تھے اور آرزومند رہتے تھے کہ وہ ان سے گفتگو کرے۔ وہ کہتی
ہے کہ "ایک لڑکا ہے جس کے تمام بدن پر عمل جراحی ہوا ہے مگر خوش و خرم ہے۔ اور
چند جلتی بھی بیچارے یہاں بیمار پڑے ہیں جس وقت سے میں یہاں آئی ہوں ان
میں سے صرف ایک مرا ہے۔ زکام اکثر ان کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

ایک شخص مانیلا کا باشندہ حالت نزع میں ہے۔ کوئی اس کی زبان بھی نہیں جانتا صرف ایک مریض کچھ کچھ اس کی گفتگو سمجھتا ہے۔ آج ایک بیچارہ حبشی ایک کمرے میں حالت نزع میں پڑا ہے اور آثار موت اس کی پیشانی سے ظاہر ہیں، لب خشک ہیں اور منہ کھلا ہوا ہے۔ میرا ارادہ ہوا کہ میں اس کے پاس جا کر اس کا حال پوچھوں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت جا کر اس کو حضرت مسیحؑ کے مصائب میں سے کچھ باب سنائے۔ اس بوڑھے آدمی کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوئی اور اس نے کہا "میں نے اپنی تمام عمر میں کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا۔ اب تمام دنیا میں صرف تم سے مجھے محبت پیدا ہوئی ہے۔ اور تم میری دوست ہو۔"

اگنس جونس کی موت سے ایک مدت قبل اس کے اور اس کی بہن کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی کہ اگر مرنا ہماری مرضی پر منحصر ہو تو ہم کیسی موت اپنے لئے پسند کریں۔ اگنس جونس نے کہا کہ بہترین موت انسان کی یہ ہے کہ جس وقت وہ عبادتِ خدا میں مصروف ہو اُس وقت اس جہان فانی کو وداع کہے۔ اور ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ اگنس نے ایسی ہی حالت میں انتقال کیا۔

ہیریٹ بیچر اسٹو

زمانۂ حال میں کسی کتاب نے خاص و عام کے قلوب پر اس قدر اثر
نہیں کیا اور ایسے فوری نتائج پیدا نہیں کئے جیسے کتاب "چچا ٹام کا جھونپڑا"
نے۔ اس کتاب کو نئی اور پرانی دونوں دنیا کے سب طبقوں کے لوگ
پڑھتے ہیں یعنی امریکہ سے لے کر بعید ترین مقامات تک تمام آدمی اس سے بڑی
بھاری دلچسپی رکھتے ہیں۔ پیرس میں لوگوں کا ذوق و شوق یہاں تک بڑھا کہ کسی فرانسیسی
مصنف اور مؤلف کی کتاب کو بھی یہ درجہ حاصل نہ ہوا تھا۔ اور کسی کتاب نے
ایسا اثر نہیں کیا تھا۔ تین روزانہ اخباروں میں ایک ساتھ اس کی اشاعت
ہوئی اور عام اشتیاق اس حد تک پہنچا کہ اخبار سیکل کے حصہ داروں نے
نہایت تعجیل سے اس کا حق تصنیف پیرس کے اخبارات سے حاصل کر لیا اور [illegible]
کہ اس کا باقی حصہ بھی جو پہلے روزنامے میں نہیں چھپا تھا وہ دوسرے
میں چھپ جائے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ کس شخص نے اس کتاب کو تصنیف
کر کے اس قدر ہیجان اور آشوب پیدا کیا۔ درحقیقت امریکہ کی غلامی کی خباثت
کا نقشہ کھینچ دیا۔ اور غلاموں کی تجارت کو منسوخ کرا کے چھوڑا۔

یہ کتاب نہ تو کسی فسانہ نگار نے لکھی ہے نہ کسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ نے بلکہ ایک غریب عورت کی تصنیف ہے جو کہ اکثر خانہ داری کی زحمتوں چھ بچوں کی پرورش اور فقر و فاقہ میں گرفتار رہا کرتی تھی، جس سے اس کے کنبہ کو اکثر سابقہ پڑتا تھا۔ مصائب اٹھانے کی وجہ سے اس میں قوت برداشت پیدا ہو گئی تھی اور اس وجہ سے اس نے اپنے ملک اور قوم کو اتنا فائدہ پہنچایا۔ خاتون موصوفہ امریکہ کے ایک خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس کے افراد آہنگری کرتے تھے۔

یہ بتاریخ ۱۴ ماہ جون ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ لیچفیلڈ (جو کانکٹی کٹ کے دیہات میں سے ہے) پیدا ہوئی۔ جب یہ چار سال کی ہوئی تو اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ چند روز کے بعد اس کی خالہ آ کر اس کو اپنے یہاں لے گئی اور اس کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لے لی۔ جس وقت ہریٹ چھ سال کی تھی اس کے والد نے عقد ثانی کر لیا۔ اس کی سوتیلی والدہ ان بچوں کے ساتھ بہت مہربانی اور محبت سے پیش آتی تھی۔ اسی زمانے میں ہریٹ کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں اس نے تعلیم میں نمایاں ترقی حاصل کی۔ ستائیس قصیدے اور انجیل کے دو بڑے جزو اس نے حفظ کر لئے۔ اگرچہ بعض اوقات ہریٹ کے یہ کام سپرد تھا کہ اپنی چھوٹی بہن کی دیکھ بھال کرے لیکن وہ اپنی تعلیم کی طرف سے بھی غفلت نہ کرتی تھی۔ اور نہایت ذہین طالبات میں سے تھی۔ اس کے والد بائیس سال ہی کی عمر میں کالج سے بہت سے امتیازات حاصل کر کے علیسائی

پادریوں کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔

ہریٹ کا طرز انشا اتنا عمدہ اور دل پسند تھا کہ اس نے بارہ سال کی عمر میں ایک مضمون اس عنوان پر لکھا کہ "آیا روح کا قدیم ہونا طبیعیات سے ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟" تو یہ مضمون علماء کی جماعت میں پڑھنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ ہریٹ خود کہتی ہے کہ "میرا مضمون سب پڑھ رہے تھے اور میرے والد میرے استاد کے پاس بیٹھے ہوئے سوال کر رہے تھے کہ یہ کس نے لکھا ہے انھوں نے جواب دیا تمھاری لڑکی نے لکھا ہے۔ واقعی وہ وقت میری عمر کے سب سے زیادہ قابل فخر لمحوں میں سے تھا" ۱۸۳۲ء میں اس کے والد سے جو چھ سال بوسٹن کے گرجا میں رہ چکے تھے استدعا کی گئی کہ وہ کانکٹی کٹ کے مدرسۂ شرعیہ کی افسری قبول کر لیں۔ انھوں نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور اپنے کنبے کے ساتھ اس شہر میں چلے گئے جس زمانے میں یہ وہاں مقیم تھے ہریٹ اکثر وہاں کے قرب و جوار میں گشت کیا کرتی تھی اور ایک خاتون کے ہمراہ جو اس کے باپ کے مدرسہ میں معلم تھی۔ اس محلہ میں بھی جاتی تھی جہاں غلام اور کنیزیں کثرت سے تھیں اور وہاں کے حالات کا غور سے مشاہدہ کرتی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے چند سال بعد جب اس معلمہ نے اس جگہ کے حالات اس میں پڑھے تو تعجب کیا کہ ہریٹ نے کس طرح وہاں کے تمام جزوی حالات کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا۔ اور وہاں کے حالات اور معاملات کو اس درستی اور صحت سے پیر

قلم کیا۔
۱۸۳۶ء میں جب اس کی عمر ۲۴ سال کی ہوئی تو اس کی شادی پروفیسر
اسٹو سے ہوگئی۔ یہ ایک بلند بالا اور خوش قامت شخص تھا۔ اس نے علم ادب
کی کافی تحصیل کی تھی۔ یونانی عبرانی، لاطینی، عربی اچھی طرح جانتا تھا لیکن
مالِ دنیا میں سے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ چند روز کے بعد اس نے نیویارک
سے لندن کو سفر کیا۔ تاکہ اپنے مدرسہ کے لئے ضروری کتابیں خریدے اور
قدیم زمانے کی تعلیم کی خصوصیات معلوم کرے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس
کے اہل وعیال اپنے باپ بھائی وغیرہ کے پاس رہے۔ یہ کبھی کبھی امریکہ
کے بعض بعض اخباروں میں مضامین بھیجتا تھا۔ اس کے بھائی نے جو ایک
اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے کاموں میں مدد دی۔ لیکن اس سفر سے اسے
چنداں نفع نہیں ہوا اور فقط اس قدر رقم حاصل ہوئی کہ اپنے لئے خوراک وغیرہ
خریدے۔ اس زمانے میں مدرسوں کے طالبعلموں میں ایک تحریک غلامی
کے برخلاف پیدا ہوئی۔ اس کا لیڈر تھیوڈور ولڈ تھا لیکن غلاموں کے مالکوں
اور امراء نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور ایک اخبار کو جس کا نام
محب بشر تھا اور جس میں غلامی کے خلاف مضمون چھپتے تھے خراب اور ضائع
کر دیا۔ اور اس کے ٹائپ کے حروف کو پراگندہ کر دیا۔ اگرچہ اس وقت
بھی ہریٹ غلامی کے قدرے خلاف تھی۔ لیکن انھوں نے اس کی موقوفی

پر چنداں اصرار نہ کیا۔

اس زمانے میں اس کے دو توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور جنوری [illegible]
میں اس کے پہلا لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بچوں کی پرورش اور خانہ داری کی مشکلات
کی وجہ سے اسے بہت تکلیف اور مصیبت تھی لیکن وہ نہایت اطمینان، استقلال
بلکہ مسرت اور شوق سے امورِ خانگی کو انجام دیا کرتی تھی، اور اضطراب کو اپنے
دل میں پیدا نہ ہونے دیتی تھی۔ بعض اوقات ان تمام کاموں کے علاوہ تصنیف
و تالیف کا کام بھی بڑھ جاتا تھا۔ واقعی زحمت پر زحمت تھی لیکن یہ ہمت سے کام
لے کر تمام فرائض کو پورا کرتی تھی۔ شدید سردی میں جبکہ اشیائے خورد و نوش
کی قیمت بہت گراں تھی۔ یہ اپنی بہن میری کو دیکھنے کے لئے (جس نے ہرٹ
فورڈ میں شادی کر لی تھی) گئی۔ یہاں اس نے بعض اخباروں کے اڈیٹروں
اور کتب فروشوں سے ملاقات کی اور اپنی کتاب کی ایک جلد جس میں بعض حکایات
درج تھیں بطور نمونہ کے ان کو دی۔ اور درخواست کی کہ اس کی اشاعت میں
کوشش کریں۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم امید دلائی لیکن اس کو پھر بھی امید تھی
کہ شاید یہ کتاب طبع ہو جائے اور کچھ مناسب نفع اس کو حاصل ہو۔ [illegible] میں
اس کے دوسرا لڑکا پیدا ہوا، اور اس کی تکالیف اور بھی بڑھ گئیں لیکن باوجود
اس کے اس نے اپنی تحریر کی مشق کو جاری رکھا۔ اور اپنے شوہر کو خط لکھا کہ ایک
کمرہ اپنے مکان میں میری نوشت و خواند کے واسطے مخصوص کر دو۔ اس کا

شوہر چونکہ خود عقلمند اور ذہین تھا اس لئے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اور شوق اور ترغیب دلائی، اور لکھا کہ "عزیز من! تم کو مصنف ہونا چاہئے۔ تقدیر کا نشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ تم عزت اور شہرت حاصل کروگی۔ اس وقت تمہارے شوہر کا سر افتخار آسمان تک پہنچ جائے گا اور تمہاری اولاد تمہیں دعائیں دے گی کوئی عورت دنیا میں تم جیسی نہیں ہے، کون ہے جس میں اس قدر قابلیت ہو اور اتنی فروتنی جس پر اس درجہ کاموں کی کثرت ہو۔ اور اتنی قلیل آمدنی میں گزارہ کرنا پڑے" مختصر یہ کہ سب نہایت سختی میں زندگی بسر کرتے تھے اور اگرچہ ان کی امید قائم تھی لیکن ان کی تکالیف اور مشکلات میں کمی نہ ہوتی تھی۔

اس کے ایک اور دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ اُن کے مدرسہ میں جو طلبہ تھے وہ بھی غریب اور تہی دست تھے اور اتنی مقدرت نہ رکھتے تھے کہ انھیں کسی طرح کی مالی امداد پہنچا سکیں۔ اکثر اوقات پروفیسر اسٹو کو اطراف و جوانب میں مدرسہ کے لئے چندہ جمع کرنے جانا پڑتا تھا اور ان کے اہل و عیال اپنے مکان میں جس طرح بن پڑتا تھا بسر اوقات کرتے تھے لیکن اس نقل و حرکت اور زیادہ سفر کرنے کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہنے لگی اور زحمت اٹھاتے اٹھاتے وہ بہت مریض اور کمزور ہو گئے مگر پھر بھی وہ بشاش اور قوی دل رہتے۔ ان کے دوستوں میں سے کسی کو اس کا حال معلوم ہوا اور انھوں نے بغیر اپنا نام ظاہر

کئے ایک معقول رقم ہریٹ بیچر اسٹو کو بھیجی اور اس کو لکھا کہ گرم پانی کے چشمہ میں نہانے کی غرض سے جائے۔ اسی عرصے میں پروفیسر اسٹو کی بھی صحت خراب ہو گئی۔ اور وہ دونوں گرم پانی کے چشموں پر چلے گئے۔ گرمی کے موسم میں ایک تازہ مصیبت ان پر یہ نازل ہوئی کہ شہر میں وبا پھیل گئی، اور چونکہ خاتون موصوفہ عیال دار تھیں لہذا سخت زحمتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ گھر میں کوئی ایسا باقی نہ رہا تھا جو اس مرض میں گرفتار نہ ہوا ہو۔ سب سے پہلے وہ ملازمہ جوان کی خدمت کرتی تھی اس مرض میں مبتلا ہوئی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سب سے چھوٹا لڑکا چارلس گزر گیا۔ اس زمانے میں اس باہمت خاتون کی عمر ۳۷ سال کی تھی اور ۱۳ سال سے مصائب اور مشکلات برداشت کرتے کرتے بالکل خستہ اور رنجور ہو گئی تھی جب اس پر یہ صدمہ پڑا۔

ستمبر ۱۸۴۹ء میں پروفیسر اسٹو سے استدعا کی گئی کہ کسی دوسرے شہر میں دینی مدرسہ کی ملازمت قبول کریں۔ اسی زمانے میں اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام چارلس متوفی کے نام پر چارلس رکھا گیا۔ اسی عرصہ میں جب ہریٹ نہایت سرگرم و مشغول تھی۔ امریکی کونسل سے ایک فرمان صادر ہوا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ جن لوگوں کے غلام بھاگ گئے ہیں یا ان کی اطاعت سے باہر ہو گئے ہیں وہ تلاش کئے جائیں اور جو غلام آزاد ہو گئے ہیں ان کو دوبارہ غلامی میں رکھ سکتے ہیں۔ اس علاقے والوں کو چاہئے کہ اس کام میں ان کو

مار دیں۔ جب غلاموں کے مالک بوسٹن میں آئے تو بہت شور و غل برپا ہوا۔ ہر
ایک دل پر وحشت اور گھبراہٹ چھا گئی۔ بھاگے ہوئے غلام، تنوروں، آتش
خانوں اور انباروں میں چھپ گئے۔ بعض اپنی جان بچانے کے لئے دور بھاگ
گئے۔ مثلاً جب ایک شیشہ فروش نے (جس کا کام خوب چل رہا تھا) سنا کہ اس کا
مالک اس کو گرفتار کرنے کے لئے آ پہنچا ہے، تو وہ گانا وانا کو بھاگا لیکن چلتے چلتے
اس کے پاؤں ورم کر گئے۔ آخر کار گرفتار ہوا اور اس کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا
گیا۔ ان کے مالک ان پر بہت سختی کرتے تھے۔ تازیانے مارتے تھے۔ جسم داغ
دیتے تھے اور فاقہ کراتے تھے اور غلاموں کو تمام تکلیفیں دینا جائز سمجھتے تھے۔
اکثر عورتوں نے جو ہیریٹ کی دوست تھیں اس کو متعدد خطوط لکھے جس میں ان
تمام مصیبتوں اور آفتوں کا جو اس قانون کے جاری ہونے سے پیدا ہوئی
تھیں، ذکر تھا۔ ایک نے اس کو یہاں تک لکھا "کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو
ان مظالم اور آفتوں کے خلاف دن رات مضمون لکھا کرتی۔ تاکہ قوم سمجھے کہ یہ
کمبخت غلامی کیسی ملعون چیز ہے"۔ جب اس نے خط کو یہاں تک پڑھا تو
خط ہاتھ سے رکھ دیا اور اپنے ایک لڑکے سے جو اس موقعہ پر اس کے پاس موجود
تھا کہا "اگر میں زندہ رہی تو ایک زبردست مضمون خاص غلامی کے خلاف
لکھوں گی۔ اس کے چند روز کے بعد اس نے مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ اور
ان تمام واقعات کو جو ہر وقت اس کے پیش نظر تھے تفصیل سے بیان کیا

ایک دن جب وہ لکھنے میں مصروف تھی۔ پروفیسر اسٹو کا کسی وجہ سے اس کے پاس آنا ہوا اور اس مضمون کے بعض صفحے دیکھ کر کہا "اس مضمون سے ایک نہایت اچھی چیز تیار ہو سکتی ہے۔" ہریٹ نے کہا کہ میرا ارادہ اس کو چھپوانے کا ہے۔
وہ روز بروز اس کام میں زیادہ منہمک ہوتی جاتی تھی۔ بعض اوقات کاغذوں کو اپنے ہمراہ باورچی خانے لے جاتی اور کھانا وغیرہ پکاتے وقت بھی لکھتی جاتی وہ خود کہتی ہے کہ میں اتنی لیاقت نہ رکھتی تھی کہ ان سب واقعات کو اپنی نگاہ کے سامنے منضبط رکھوں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے خود بخود لکھا گیا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی کارنمایاں کروں اور اس مشکل کو حل کروں اور نہ میرا یہ مقصد تھا کہ کوئی عزت یا شہرت حاصل کروں لیکن یہ محض میری خوش قسمتی تھی۔ فی الحقیقت میرا قلم خدائے تعالیٰ کے اختیار میں تھا۔ جو کچھ مشیت میں ہوتا تھا وہ میرے قلم سے نکلتا تھا۔ اور میں صرف آرزو کار تھی کہ اس کا مقصد پورا ہو۔"
اس کا شوہر اس کتاب کے بارے میں کہتا ہے "کہ یہ کتاب بڑی محنت اور دقت سے لکھی گئی ہے لیکن اس کی اجرت اور امید صرف یہی تھی کہ غریبوں کی دعائیں ملے۔" اس کتاب کی اشاعت پانچ ماہ جون ۱۸۵۱ء کو اخبار "عہد ملی" میں شروع ہوئی اور اپریل کی ابتدا میں اختتام کو پہنچی۔ اس اخبار نے ہریٹ کو حق تصنیف نو سو روپئے دیئے۔ جس زمانے میں یہ کتاب اخباروں میں شائع ہو رہی تھی بوسٹن کے ایک کتب فروش مسٹر جویٹ

نے اس کو غور سے مشاہدہ کیا اور مصنفہ سے استدعا کی گئی کہ اس کو کتابی صورت میں علٰحدہ شائع کیا جائے اس شرط پر کہ اس کے تصف خرچ کی مصنفہ متحمل ہو۔ اگرچہ یہ خاتون اور اس کا شوہر اتنے غریب تھے کہ اس کام میں مدد دینا ان کے امکان سے باہر تھا، لیکن اس نے اقرار کر لیا اور اس کو طبع کرنے کی اجازت دیدی۔ اور حق تصنیف معاف کر دیا۔ اس کتاب کو ختم کرتے ہی ہریٹ سخت بیمار پڑ گئیں۔ کتاب کے شائع ہوتے ہی اس کی اشاعت اور استقبال اس قدر ہوا کہ امید اور حوصلہ سے کہیں بڑھا ہوا تھا۔

پہلے ہفتہ میں اس کتاب کی تین ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں۔ دوسرے ہفتہ طبع ثانی کرنی پڑی۔ اور ایک سال کے عرصہ میں ایک سو بیس مرتبہ طبع ہوئی۔ صرف امریکہ میں ہی تیس ہزار سے زائد جلدیں اس کی فروخت ہوئیں۔ اور طبع کرنے والوں نے بہت نفع اٹھایا۔ بہ چھتیس ہزار روپے مصنفہ کو پیش کئے گئے۔ اس سے اس خاندان کو بہت فائدہ پہنچا۔ ہریٹ کے شوہر نے اس سے کہا "ساری عمر میں میں نے یہ زیادہ سے زیادہ رقم دیکھی ہے!" انگلستان میں اپریل سے دسمبر تک یعنی نو مہینے میں بارہ مرتبہ یہ کتاب شائع ہوئی۔ سترہ کتب فروش کمپنیاں اس کو فروخت کرتی تھیں۔

حساب کیا گیا ہے کہ انگلستان میں ۱۵ لاکھ کتابیں فروخت کی گئی ہیں۔ اور اب تک بیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، یعنی ارمنی، بوہیمی، ڈینش

ولندیزی، فلیمش، فرانسیسی، جرمنی، اطرشی، الیرین، اطالوی، پولستانی، پرتگالی، یونانی قدیم و جدید، روسی، سردی، اسپینی، ڈینش، ولنزی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں اس کتاب کا مکمل ڈراما تھیٹر میں کیا گیا اور اسی سال لندن کے دو تھیٹروں نے اس کا تماشہ کیا۔ اس کتاب کو جس قدر مقبولیت اور اشاعت ہوئی اس سے پہلے کسی کتاب کی نہ ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ان تمام مصیبتوں اور آفتوں کا بیان ہے جو بدبخت غلام اور کنیزیں اٹھاتے تھے۔ اس بدترین سلوک کا جو غلاموں کے ساتھ ہوتا تھا اور اس ظلم و ستم اور غصہ و غضب کا جو آقاؤں کا عام دستور تھا بہ تفصیل ذکر تھا۔ ان بدنصیبوں کی فلاکت اور ذلت کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ پڑھنے والوں کو ان سے ہمدردی پیدا ہو۔ اور ان پر رحم کھائیں۔ ان کے آقاؤں کی بے رحمی اور ظلموں کو ایسا مجسم دکھایا تھا کہ ناظرین کے دلوں میں ان کی نفرت بیٹھ جائے، یہ ممکن نہیں کہ کوئی اس کتاب کا مطالعہ کرے اور اس کا دل ان نفرت انگیز حرکات سے آزردہ نہ ہو اور ان زحمتوں اور تکلیفوں کے خیال سے رقت طاری نہ ہو۔ جو ان بیگناہ غلاموں پر نازل ہوتی تھیں۔ اس کتاب نے جس حد تک لوگوں کے دلوں کو متاثر کیا اور فائدہ پہنچایا، اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ لاکھوں غلام اور کنیزیں جو ہمیشہ آفت میں گرفتار رہتے تھے جن پر ستم قسم کے ظلم کئے جاتے تھے سب اس کتاب کے طفیل آزاد ہوگئے اور تمام قیود جو غلامی کی وجہ

سے ان پر عائد تھیں ٹوٹ گئیں۔ درحقیقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب نے لاکھوں
خدا کے بندوں کو جو غلامی کے تاریک غار میں پڑے تھے نکال کر آزادی کے
سائے میں بٹھا دیا۔ ان کے جان و مال کو جو ان کے آقاؤں کے قبضہ میں تھے
ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ مئی ۱۸۵۲ء میں ہریٹ بیچر اسٹو چند روز
کے لئے اپنے بھائی کے پاس بروکلین چلی گئی۔ اسی زمانے میں اس کے شوہر
سے استدعا کی گئی کہ اندوور کے مدرسہ میں مذہبی تاریخ کی تعلیم کا صدر ہو جائے
اس لئے اسے اس شہر سے مراجعت کرنی پڑی۔ شہر اندوور کی آب و ہوا نہایت
عمدہ ہے اور وہ ہر لحاظ سے اچھا شہر ہے۔ انہی زمانے میں اس نے دیکھا کہ
بعض عالم اور مصنف اس کی کتاب "چچا ٹام کا حجرہ" پر تنقید اور نکتہ چینی
کر رہے ہیں اور اس کے بارے میں بڑے بڑے مضامین لکھ رہے ہیں۔ لہٰذا
ان کی روک تھام کرنے اور الزامات کی تردید کی غرض سے ایک کتاب جس کا
نام "چچا ٹام کا حجرہ اور اسکی تشریح" تھا لکھنی شروع کی۔ جس میں اس نے نہایت
زبردست دلائل اور براہین سے ثابت کیا کہ اس نے اپنی کتاب میں کوئی دُسرولی
بات نہیں لکھی، اور نہ کہیں مبالغہ یا مغالطہ برتا ہے۔ بلکہ اس کی تمام باتیں حقیقت
اور صداقت پر مبنی ہیں۔ غلاموں پر سختی اور شدت کے جو حالات اس میں دکھائے
گئے ہیں وہ دراصل ان پر گزرتے ہیں۔ یہ کتاب اپریل میں مکمل ہوئی۔ اسی مہینے
میں شہر گلاسگو میں ایک انجمن غلامی کے خلاف منعقد ہوئی۔ اس میں ہریٹ بھی

بلائی گئی بول پول پہنچنے پر اس کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ لوگ جوق جوق آتے تھے کہ اس محترم خاتون اور بلند پایہ مصنفہ کو دیکھیں جس نے انسانی ہمدردی کی وجہ سے زبردست خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد جب ریل کے راستے سے وہ اسکاٹلینڈ کا سفر کر رہی تھی تو ہر اسٹیشن پر لوگ اس کی ملاقات کے اشتیاق میں موجود ہوتے تھے۔ خود ہریٹ کہتی ہے کہ میرے دل سے کبھی وہ محبت اور خلوص محو نہیں ہو سکتا اور میرے کان وہ محبت بھری باتیں نہیں بھول سکتے جو وہاں کے لوگ جوش کے عالم میں کہتے تھے "خوش آمدید"، "اسکاٹلینڈ آنا مبارک ہوا"۔ گلاسکو کے قیام کے زمانے میں اسے ہزاروں محبت آمیز خطوط لوگوں کی جانب سے ملے جن میں اظہار محبت تھا اور اس کی تعریف و توصیف میں اشعار لکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد قرب و جوار کے شہروں سے اس کے پاس خط آئے۔ جن میں اس کا بہت شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اپنی احسانمندی کا اظہار تھا۔ ہریٹ کہتی تھیں کہ جس جگہ میں جاتی تھی تمام کوچہ اور بازار ان لوگوں سے بھر جاتے جو میرے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ اگرچہ جس روز وہاں پہنچی نہایت تھکی ہوئی تھی، لیکن لوگوں کا شوق اور شغف اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے مجبوراً بستر سے اٹھنا پڑا اور اس جلسہ میں جو محض اس کے اعزاز میں کیا گیا تھا شریک ہونا پڑا جس میں تقریباً دو ہزار اشخاص شریک تھے۔ اڈنبرا میں داخلے کے وقت وہاں

بیگسلز بیگی مع مختلف جماعتوں کے نمائندوں کے موجود تھا۔ یہ سب نہایت معزز اور قابل اشخاص تھے۔ اس کا استقبال باقاعدہ کیا گیا اور ان سب لوگوں سے تعارف کرایا گیا جو غلامی کی مخالف انجمن کے رکن تھے۔ چند روز اس جگہ بہ خوشی گزارنے کے بعد ابرڈین اور ڈنڈی میں قیام رہا اس کے بعد لندن روانہ ہوئی۔ یہاں اس کا نہایت ہی شاندار استقبال اور احترام کیا گیا۔ شہر کے چند بڑے بڑے رئیس اس کو اس کی قیام گاہ سے اپنے مکان لے گئے جہاں اس کے لئے ہر طرح کی راحت اور آسائش کے اسباب مہیا تھے۔ اس اعزاز اور احترام کے علاوہ ہریٹ کو ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں بڑے بڑے لارڈ اور ڈیوک جمع تھے۔ مدعو کیا گیا۔ اور لارڈ شیفٹسبری نے (جو خود انسانی ہمدردی کی وجہ سے بہت بڑی خدمت کر چکے تھے) ایڈریس پڑھا۔ انگلستان کے ایک خاندانی اور معزز شہزادے نے طلائی دست بند یادگار کے طور پر اس کو پیش کیا۔ یہ دست بند نہایت خوبصورت بنا ہوا تھا۔ اس کی شکل ایک قیدی کی سی تھی، جس کے ہاتھ پاؤں میں غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپر انگلستان سے غلامی کی رسم کے منسوخ ہونے کی تاریخ کندہ تھی، (اس کے چند سال بعد امریکہ میں غلامی کی منسوخی کی تاریخ اس پر ثبت کی گئی)۔ اس کے بعد لندن کے کسی محلہ کی ایک شریف اور معزز لیڈی نے تعظیماً ایک نقرئی دوات اس کو ہدیتاً دی، جو نہایت نازک اور خوبصورت بنی ہوئی تھی۔

یہاں سے وہ پیرس گئی وہاں چند روز رہنے کے بعد لیون اور جنیوا کی عازم ہوئی اور آلپس کے پہاڑوں کو دیکھا۔ وہاں کے گاؤں گاؤں اور گھر گھر کے رہنے والے سب اس کتاب کو پڑھ چکے تھے۔ اور اس کے مطالعے سے بہت خوش اور شاد تھے۔ یہ کتاب لوگوں کو یہاں تک پسند تھی کہ وہاں کی ایک خاتون نے اس سے کہا "اے معزز خاتون! کیا اچھا ہو کہ آپ ایک اور کتاب اس بارے میں لکھیں اور جہاں تک ممکن ہو اس کو زیادہ مفصل اور واضح کریں تاکہ ہماری جاڑے کی راتیں جو بہت لمبی ہوتی ہیں آسانی سے کٹ سکیں۔" پھر یہ جرمنی، بلجیم اور ہالینڈ ہوتی ہوئی پیرس واپس آئی۔ وہاں سے لورپول ہو کر انگلستان سے رخصت ہو گئی۔ اس سفر سے جو اثرات ہیریٹ بیچر اسٹو کے دل پر ہوئے ان سب کا مفصل ذکر اس نے ایک علاحدہ کتاب میں کیا ہے جس کا نام "تذکرۂ ممالک خارجہ" ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک دوسری کتاب غلامی کے انسداد میں لکھنی شروع کی جس کا نام ڈرڈ تھا اس کتاب کی تصنیف میں اس کو بہت محنت اور دقت اٹھانی پڑی، اور ایک عرصۂ دراز تک اس میں مشغول رہنا پڑا۔ اس کا طرز بیان نہایت دلکش تھا۔ مناسب استعارے اور نکتے نہایت فصاحت اور بلاغت سے تحریر کئے گئے تھے۔ ایک لطیف حکایت کے مطالعہ سے جو اس کتاب میں درج ہے معلوم ہو سکتا ہے کہ مصنفہ نے کتنی محنت اور زحمت اس کتاب کی ترتیب میں اٹھائی ہے۔ اس میں لکھا ہے "ایک رات کو جو نہایت

اندھیری تھی اور جس میں ہر چیز کی روشنی زائل ہو گئی تھی، زور کا طوفان آیا۔ بجلی
کی کڑک ایسی تھی کہ آدمیوں کے جسم میں رعشہ ڈالتی تھی۔ بادل کی گرج عمارتوں
کی بنیادوں کو ہلائے دیتی تھی۔ اندھیری رات میں (جو شب دیجور کی
مانند تھی) بجلی چمک کر تمام چیزوں کو روز روشن کی طرح دکھاتی تھی اور لوگوں کو حیرت
زدہ کر دیتی تھی۔ گویا روشنی اور تاریکی میں جنگ ہو رہی تھی کہ کبھی ایک طاقت
غالب آ کر تمام دنیا کو سیاہ اور اندھیرا کر دیتی اور کبھی دوسری طاقت تمام عالم کو
دن کی مانند روشن بنا دیتی تھی۔ طوفان کا شور سب سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ سوائے
کڑک اور گرج کے جو طوفان سے بھی زیادہ تھی کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔
جس وقت بجلی چمکتی تو ہوا ایسی معلوم ہوتی گویا بارش کے قطرے آپس میں مل
گئے ہیں اور ریت کے ذرے چمکتے ہوئے جواہرات کی مانند ہر طرف برس رہے
تھے۔ ایک طرف تو طوفان جنگل کے درخت تک اکھاڑے ڈالتا تھا اور صحرا میں
ریت کے ہزاروں ٹیلے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری جانب ہوا دریا کو متلاطم
کر رہی تھی اور تہہ تک کا پانی اچھالتی تھی۔ مختصر یہ کہ گویا آسمان سے دنیا والوں
پر غضب نازل ہو رہا تھا یا یہ کہنا چاہیئے کہ قیامت آ گئی تھی اور اسرافیل صور
پھونک رہے تھے" اس حالت میں اس کی دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں
دیکھا کہ یہ بستر پر لیٹی ہوئی کسی سوچ میں غرق ہے۔ اور طوفان کو جس کی شدت
میں کوئی کمی نہ تھی دیکھ رہی ہے۔ اور غور و فکر کے میدان میں گھوڑے دوڑا رہی

ہے جب دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا "کہ میں اپنی کتاب میں اس طوفان اور بارش کا حال درج کر رہی تھی، اب یہ دیکھتی ہوں کہ آیا جو شرح میں نے لکھی ہے وہ مطابق اصل ہے یا نہیں"

اس کتاب کی تصنیف سے فراغت پا کر ۱۸۵۲ء میں یہ مع اپنے شوہر کے بحر اوقیانوس عبور کر کے انگلستان آئی قیامِ لندن کے زمانے میں ملکۂ وکٹوریہ اور ان کے شوہر پرنس آلبرٹ سے ملاقات ہوئی۔ ملکہ نے ان کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی اور محبت کا برتاؤ کیا۔ پروفیسر اسٹو نے اس ملاقات کی بات لکھا ہے "ملکہ واقعاً میری بیوی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور مجھ سے بھی ان کی وجہ سے مہربانی کا برتاؤ کیا گیا۔ علیا حضرت نے ہمارا شہزادہ البرٹ سے تعارف کرایا۔ شہزادہ موصوف نے نہایت خندہ پیشانی سے دو مرتبہ ہریٹ سے اور دو مرتبہ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس دوران میں ان کے چاروں بچے ہماری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، اور "چچا ٹام کا حجرہ" کی مصنفہ کا ایک دوسرے سے تعارف کراتے تھے۔ ملکہ کے ملازموں میں سے ایک نے کتاب "دریڈ" کو ہم سب کی جانب سے نہایت ادب سے ملکہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بعد میں ایک خاتون نے جو ملکہ کی سہیلی تھیں، مجکو بتایا کہ ملکہ اس کتاب کو پہلی کتاب پر ترجیح دیتی ہیں۔ اور اس کو اس سے بہتر اور مکمل خیال کرتی ہیں۔

اس کے بعد یہ لوگ چارلس کنگسلے سے ملاقات کرنے گئے جو انگلستان کا بہت

مشہور مصنف گزرا ہو۔ ہریٹ بیچر اسٹو تین روز ان کے گھر مہمان رہی اور اس کے حسنِ کلام اور لطف بیان سے بہت محظوظ ہوئی، پھر وہ اپنے وطن واپس آئی اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ اس نے اور کئی کتابیں تصنیف کیں لیکن کسی کتاب کو اتنی شہرت اور مقبولیت عام حاصل نہیں ہوئی جیسی "چچا ٹام کا حجرہ" کو۔ اسی سال میں مسز اسٹو تیسری اور آخری مرتبہ انگلستان گئیں۔ ان کے شوہر اور چھوٹی لڑکی ہمراہ تھے۔ اس مرتبہ ایک شہزادے نے ان کا نہایت گرمجوشی اور محبت سے استقبال کیا۔ فلورنس میں تمام خاندان اسٹو کے افراد جمع ہوگئے اور جس زمانے میں یہ مہمان خانے میں تھے ہر ایک تفریح طبع کے لئے مختصر مختصر حکایتیں لکھتا تھا جو سب کو سنائی جاتی تھیں مسز اسٹو اس میں شریک تھیں۔ انھوں نے ان سب حکایات کو جمع کر لیا اور چار سال بعد ایک کتاب کی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اس کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ امریکہ میں خانگی جنگ شروع ہوگئی اور نہایت زور و شور سے جاری ہوگئی یعنی غلاموں اور لونڈیوں کے آقا ان کی آزادی میں حائل ہوئے جن لوگوں کے دلوں میں نسانی ہمدردی اور ترس تھا وہ ان بیچاروں کی آزادی کے لئے حتی الامکان کوشش کرتے تھے۔ یہ جنگ عظیم تھی جو آپس میں جاری تھی۔ جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ ان میں سے سب سے پہلا شخص ہریٹ کا بیٹا فریڈریک تھا۔ اس معرکے میں اس نے ایسی مردانگی اور

جرأت دکھائی کہ وہ "پادری" کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔

نومبر ۱۸۶۲ء میں ایک جلسہ آزادی کی خوشی اور اس میں مدد دینے والوں کے شکریے میں منعقد ہوا جس میں ہزاروں غلام اور کنیزیں بھی شامل تھیں ہریٹ بھی اس میں مدعو تھی۔ وہ فوج جس میں ان کا لڑکا شامل تھا جلسہ کے قریب ہی ٹھہری ہوئی تھی۔ اس لئے وہاں کے تمام معززین اور شریف اشخاص بھی اس خدا کا شکر ادا کرنے اور خوشیاں منانے کیلئے جلسے میں شامل ہو گئے فرڈرک بھی اپنی ماں کے پاس آیا۔ اور اپنے تمام بھائی بہنوں سے ملاقات کی اور جو مہمیں اس نے سر کی تھیں، ان کے حالات بیان کئے بعد ازاں جنگ گیٹسبرگ میں اس کے ایک شدید زخم لگا۔ اور سخت چوٹ سے سر پھٹ گیا۔ ہر چند علاج کیے گئے لیکن اس صدمے نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا کہ حواس مختل ہو گئے فلوریڈا میں اس کے لئے ایک مرغزار خرید دیا گیا اور خیال تھا کہ صحرا کی آب وہوا اس کے لئے نفع مند ثابت ہوگی۔ پھر اس کو سان فرانسسکو بھیجدیا گیا۔ لیکن یہ اس سفر سے واپس نہ آیا اور پھر کبھی اس کا پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔

جب جنگ انتہا کو پہنچ گئی تو پھر ایک شخص نے یہ تحریک اٹھائی کہ غلاموں کی آزادی کے مسئلہ کو ترک کر دیا جائے۔ ہریٹ نے کسی اخبار میں ایک خط چھپوایا اور اس مذموم رسم کو منسوخ کرنے کی بڑے زور شور سے تاکید کی۔ یہ خط اتنا خوش اسلوب اور بامعنی تھا کہ مسٹر جان برائیٹ نے جو انگلستان کے

ایک مشہور سیاست داں تھے۔ اس کو بہت پسند کیا۔ اس خط کے چند فقرے درج کئے جاتے ہیں "یہ کیا کہا جا رہا ہے؟ کیا ہم اس آزادی کے مسئلہ کو ترک کردیں ، ان اسی لاکھ بندگانِ خدا کو غلامی کی ذلت میں پڑا رہنے دیں۔ اور ان سے منہ موڑ کر ان کو تقدیر پر چھوڑ دیں جس طرح ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کا وجود ہے۔ اسی طرح ہم کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ایک دن جزا و سزا اور عذاب و ثواب کا بھی ہمارے واسطے آئے گا۔ اور ہماری بے اعتنائیوں کی وہاں پوچھ ہوگی" قصہ مختصر یہ کہ اس مسئلہ کو ترک نہ کیا گیا۔ اور ۱۸۶۹ء میں وہ سب لڑائی جھگڑے جو آزادی حاصل کرنے کے لئے ہو رہے تھے ختم ہوگئے۔ اور اس تمام جدوجہد کی شروع کرنے والی نے اپنی تکلیفوں اور زحمتوں کا ثمرہ اپنے مرنے کے قبل دیکھ لیا۔

۱۸۶۳ء میں اس کے شوہر نے تعلیم و تدریس کی ملازمت ترک کردی اور ان کا خاندان ہرٹفورڈ میں مقیم ہوا۔ یہ مقام نہایت عمدہ اور صاف تھا اور اس کے چاروں جانب نارنگی۔ لیموں۔ گلاب۔ نرگس کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ بہار کے زمانے میں جب بقول شیخ سعدی علیہ الرحمۃ "جاڑے کا زور گھٹ گیا تھا اور گلاب کا زمانہ آگیا تھا" پروفیسر اسٹو اور مسز اسٹو (جن کے بال سفید ہوچکے تھے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہیں، اور ایک صندوقچہ کتابوں کا بھرا ہوا ان کے نزدیک رکھا ہوا ہے۔ ان کے بچے باغ

میں پھول توڑنے میں مصروف ہیں۔ یہ خاتون دوسرے مصنفین کی طرح غرور و تکبر بالکل نہ رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک خاتون صرف ان سے ملاقات کرنے کی خاطر بہت دور سے آئیں، جب اس باغ میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ ایک چھوٹے قد کی عورت پھول توڑ رہی ہے۔ اس نے دریافت کیا "کیا میں مسز اسٹو سے ملاقات کر سکتی ہوں؟" انھوں نے فوراً جواب دیا "میں ہی مسز اسٹو ہوں"۔ خاتون نے معذرت چاہی کہ میں آپ کے کام میں حارج ہوئی مگر مسز اسٹو نے کوئی خیال نہ کیا بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا اور ایک پھولوں کا گلدستہ بنا کر بطور تحفہ اس کو پیش کیا۔

ضعیفی کے زمانے میں اس کو نسیان کی بیماری ہو گئی تھی بعض اوقات وہ بڑے اہم کام بھی بھول جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے باغ میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو گارڈن پارٹی دی اور دعوتی کارڈ سب کے پاس بھیج دیئے، لیکن اس کا خیال بالکل ذہن سے اتر گیا۔ اور اپنے بچوں اور ہمسایوں کو ساتھ لے کر جنگل سیر کے لئے چلی گئی۔ دعوت کا وقت ہو گیا تمام لوگ آ کر انتظار کرنے کے بعد واپس ہو گئے۔

مسز اسٹو چونکہ عالم باعمل تھی اس واسطے جن باتوں کی دوسروں کو نصیحت کرتی تھی۔ ان پر خود بھی کاربند تھی۔ اس کی ستر سالہ سال گرہ کا جشن اس علاقے کے حاکم کے مکان پر منعقد ہوا، اس کے بھائی نے ایک

ایڈریس پڑھا اور مختلف لوگوں نے چند قصیدے اس کی تعریف میں پڑھے۔ بعد ازاں خود خاتونِ موصوفہ آگے بڑھیں اور انھوں نے چند باتیں بیان کیں اور کہا کہ "اول میں اپنے سب دوستوں اور حاضرین کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ دوسرے ایک یہ نصیحت کرتی ہوں کہ اگر تم میں سے کوئی کسی وقت محنت یا مصیبت سے دوچار ہو۔ یا تم کسی رنج والم میں گرفتار ہو تو تمھیں یہ سوچنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے تمھارے حال پر کیا کیا لطف وعنایات کی ہیں اور اس بات کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ غلامی کا بارِ گراں ہمیشہ کے لئے تمھارے سروں سے دور ہو گیا۔ میں دیکھتی ہوں کہ جنوب کی طرف اس مسئلہ سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ جب میں وہاں کا سفر کرتی ہوں ان کے چھوٹے چھوٹے اور کچے مکانات نظر آتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ روز بروز دولتمند ہوتے جاتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم ان سے سلوک اور خاطرداری کریں۔ کیونکہ ان میں عقل کی بہت کمی ہے اور بعض نقص ان میں ایسے ہیں جو شاید سفید رنگ کے لوگوں کو نہایت خراب معلوم ہوں لیکن وہ خوش اور شاد رہتے ہیں۔ اور تم لوگوں سے بہت زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خوش اور مسرور رہنے کا کیا طریقہ ہے۔ ہمارے ایک حبشی دوست کے پاس ایک دو منزلہ مکان، نہایت خوبصورت اور نارنگیوں کا باغ اور شکر کا کارخانہ ہے اور اس کے علاوہ بھی اس کے پاس بہت کافی دولت ہے۔ ایک دن میرے

شوہر نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے باتوں کے دوران میں ذکر کیا "کہ میرے
پاس بیس گائے بیل وغیرہ، چار گھوڑے اور چالیس مرغ ہیں۔ میرے
دس بیٹے بھی ہیں جو گویا میرا ہی مال ہیں اور میں جس بات کو عام کرنا چاہتا ہوں
وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے نفس اور مال کا مالک ہو اور تمام آدمی آسودہ ہو جائیں
ہم کو ہرگز شک اور وسوسہ میں پڑنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ جو واقعہ کسی کو پیش
آتا ہے۔ اس کا پیش آنا لازمی ہوتا ہے" آخری پبلک لکچر جو مسز اسٹو
نے دیا یہی تھا۔ اس کے بعد چند دن اپنے مضامین اور خطوط جمع کرنے
میں گزارے اور چھوٹے بیٹے مسٹر اسٹو کو وصیت کی کہ اس کی سوانحعمری
لکھے۔ اس نے ایک نہایت عمدہ کتاب اس موضوع پر لکھی۔ اور اس
بیان میں زیادہ تر حصہ اسی کتاب سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ اب اس کا ایسا
زمانہ آ گیا تھا کہ یہ راحت سے زندگی بسر کرے اور دنیا کی مشقتوں اور
مصیبتوں سے نجات پائے لیکن اس زمانے میں اس پر ایک سخت اور تازہ صدمہ
یہ گزرا کہ اس کے شوہر نے اگست ۱۸۹۶ء میں اس دنیائے فانی سے انتقال
کیا۔ اس صدمہ نے اس کو بہت رنجیدہ اور نڈھال کر دیا۔ اور ۲۸ جون ۱۸۹۶ء
میں اس پر فالج گرا اور چہار شنبہ کے دن یکم جولائی کو ۸۶ سال کی عمر میں اس دارِ فانی
سے سفر کیا۔ اور اپنا مفارقت کا داغ اولاد اور احباب کے دلوں پر چھوڑ گئی۔

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپی